اُندلس میں اجنبی

مستنصر حسین تارڑ

Part -1





کیپٹن پائلٹ

ساجد نذیر شہید کے نام*

کیسا ایسا ممکن ہے کہ میرے سامنے اب ہمیشہ کے لیے ایک خلا ہوگا، صرف ہوا ہوگی، ساجی کا جسم نہ ہوگا جس پر میں ہاتھ رکھ سکوں، جسے چوم سکوں، جسے گلے لگاؤں، کیا ایسا ممکن ہے؟

○

مرہمِ لطف و وفا تجھ کو کہاں سے آئے زخم
ہم سفر تجھ کو کہاں لے گئی تیری پرواز
آگ کس طرح ترے جسم کے نزدیک آئی
کیسے پٹرول کے شعلوں سے دبا شعلہ ساز

(مصطفیٰ زیدی)

---

* میرا خالہ زاد بھائی، والدین کی اکلوتی اولاد، جو ۳ جولائی ۸۵ء کی صبح کوئٹہ میں کسی فنی خرابی کی بنا پر اپنے ہی ہوائی جہاز کے شعلوں کی لپیٹ میں آیا اور اُس کا سلگتا ہوا ۲۴ سالہ بدن ۶ جولائی ایک بجے دوپہر ہمیشہ کے لیے سرد ہوگیا۔

فہرست

کرنل محمد خان

مصنف عموماً اپنی پہلی کتاب پر دوسروں سے دیباچہ لکھواتے ہیں کہ قارئین سے تعارف بھی ہو جائے اور زبانِ غیر سے اپنے مخفی محاسن بھی آشکار ہو جائیں۔ بعد کی کتابوں پر دوسرے لوگوں کے دیباچوں اور مقدموں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی فارمولا علامہ اقبال نے برتا اور بے شمار یا شما قسم کے مصنفین نے بھی لیکن مستنصر حسین تارڑ اس قاعدے کے اُلٹ چلے ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے سفرنامے کا دیباچہ خود لکھا اور کسی بیرونی سفارش یا دباؤ کے بغیر اپنے گُن گوائے اور گنوائے۔ اب ان کے دوسرے سفرنامے پر ایک غیر کے لیے کچھ مقدمہ لکھنا گیسوئے تابدار کو اور تابدار کرنے کی کوشش ہے جو ایک لاحاصل کوشش ہے کہ مستنصر کی رچی ہوئی تاب میں کسی مزید تاب کی گنجائش نہیں اور اِدھر میری نثر طلی بالکل محدود بلکہ مفقود ہے۔

چند سال ہوئے میں نے پہلے مستنصر کا سفرنامہ "نکلے تری تلاش میں" پڑھا اور پھر مستنصر سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر خوبصورت پایا اور یہ اسی دوچند حُسن کا رعب ہے کہ جب مجھ سے موجودہ سفرنامے کا دیباچہ لکھنے کو کہا گیا تو میں نے چاروناچار فی الفور لبیک کہا حالانکہ دیباچہ لکھنا تو درکنار، مجھ سے کوئی گرد پوش کے لیے چند سطور بھی لکھنے کو کہے تو مہینوں روپوش رہتا ہوں کہ کہیں لکھنی ہی نہ پڑ جائیں۔ میرا دیباچہ نویسی کا خانہ یکسر خالی ہے۔

مستنصر کا نیا سفرنامہ مجھ تک کتابی شکل میں نہیں، اجزا کی صورت میں پہنچا۔ کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے۔ گویا اسے صحیح معنوں میں پڑھا نہیں، صرف چکھا ہے اور

مجھے پڑھ کر معلوم ہوا کہ اس کی لذت پہلے سفرناموں سے کسی طور کم نہیں۔ عین ممکن ہے کہ اُندلس کے تمام تر سفر میں ان کے ساتھ گھومتا تو اس کتاب مستطاب کی کئی خصوصی لذتوں سے آشنا ہوتا۔ بہرحال "اُندلس میں اجنبی" پڑھنے کے بعد ایک بات طے ہے کہ جوں جوں مستنصر کا قدم جوانی سے کہولت کی طرف بڑھتا ہے اس کی تحریر جوان تر ہوتی جا رہی ہے اور ایک مصنف کی آبرو یا عظمت اس کی تحریر کی جوانی ہے جو لازوال ہے نہ کہ اس کا اپنا شباب جو بہرحال ناپائیدار ہے (خدا مستنصر کا شباب تادیر قائم رکھے)۔

ادب میں آج کل سفرناموں کا فیشن بہت چل نکلا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے لیے تخلیقی کرب میں ڈوبنا پڑتا ہے نہ بحرِ علم میں شناوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس سُوئی کے جس ناکے سے مسافر گزرا، اسی سے قاری کو بھی گزار دیا اور سفرنامہ بن گیا۔ بعض چلتے پھرتے لوگ سفر کو اس لیے بھی موضوعِ سخن بناتے ہیں کہ اس میں اہلِ وطن کی نظروں سے دُور، اجنبی دیار میں موضوع کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ نتیجتاً سفرنامہ کم اور مزاح پارہ زیادہ بن جائے تو اسے گھاٹے کا سودا نہیں سمجھا جاتا۔ بحیثیتِ مزاح نگار میرا اپنا طریقۂ واردات بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اس کے برعکس زمانۂ قدیم کے سفرنامے پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان تاریخی اور جغرافیائی کھنڈروں سے گزر رہا ہو اور مسافر راستے کی ہر سرائے اور کنویں پر علم کے انبار لگا کر اعلان کر رہا ہو کہ "لو بیٹا، جتنا ہضم کر سکتے ہو، کر لو اور باقی آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دو۔"

مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے قدیم اور جدید سفرناموں کا سنگم ہیں۔ ان میں پرانے سفرناموں والی معلومات بھی ہیں اور ماڈرن سیاح کا چمکتا ہوا مشاہدہ بھی۔ اس کا قاری بیک وقت ماضی اور حال میں سفر کرتا ہے۔ ماضی کا نقشہ جمانے کے لیے مستنصر تاریخ کا سہارا لیتا ہے اور حال کو بیان کرنے کے لیے وہ اپنے مشاہدے پر اکتفا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں اختلافِ رائے ممکن ہے کہ خود مؤرخین میں اختلاف ہے لیکن دوسری صورت میں نہیں کہ مستنصر کا مشاہدہ کھرا، خالص اور ناقابلِ تردید ہے۔

مستنصر ان سیاحوں میں سے نہیں جو جمبو جیٹ میں بیٹھ کر مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتے ہیں یا ایک 'اے کلاس' ہوٹل سے دوسرے 'اے کلاس' ہوٹل میں شب بسری کو سیاحت کا نام دیتے ہیں۔ مستنصر دھرتی کے ساتھ چلتا ہے۔ لغوی معنوں میں بھی اور استعارۃً بھی۔ وہ آپ کو قریہ قریہ، نگری نگری، کوچہ کوچہ پیدل چلتا یا مقامی بس یا ریل میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مشاہدے میں آنے والے انسان ہیں — دھرتی پر چلنے پھرنے والے عام انسان! ان میں بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، حسین بھی اور کریہہ بھی، عظیم بھی اور حقیر بھی۔ وہ ان میں سے کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ کسی کو اپنے طنز یا تضحیک کا نشانہ نہیں بناتا۔ اس کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ اسے دھرتی کے تمام باشندے ایک ہی برادری کے بکھرے ہوئے فرد لگتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ وہ کولہو کا بیل ہے جس کے کندھے پر 'پنجالی' اور آنکھوں پر کھوپے ہیں اور وہ زندگی کے شب و روز ایک جانکاہ ڈگر پر گزار رہا ہے۔ چنانچہ وہ بقول خویش "رسّے تڑا کر" ملک سے باہر بھاگ نکلتا ہے لیکن دیارِ غیر میں پہنچ کر، خواہ وہ کتنے ہی "گلچھرّے" اُڑا رہا ہو، اسے ہر وقت محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل کے تار ارضِ وطن سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی ظاہری نگاہ غرناطہ پر ہوتی ہے لیکن باطن کی آنکھ لاہور پر۔

مجھے مستنصر کے سفرناموں میں جس چیز سے جادو ہو جاتا ہے وہ ان کی فضا ہے:
وہ دلربا سی نیم اُداس فضا، نیم اُداسی جو مستنصر کی نشیلی آنکھوں میں ہے، اس کی تحریر میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسی نیم اُداس فضا جس میں غم کے گہرے بادل ہیں نہ خوشی کی چمکدار دھوپ۔ بس دونوں کے بین بین رومانیت کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر، ریشمی سی اُداسی میں لپٹا ہوا سفر جو محض سفر برائے سفر ہے۔ اس میں دُنیا کو فتح کرنے، علم حاصل کرنے یا معاشرے کو سنوارنے کی کوئی آلائش نہیں۔ مسافر کو صرف دُنیا دیکھنے اور اہلِ دُنیا کا تماشہ کرنے کی آرزو ہے۔

اس آوارہ گردی میں جو مقامات اور شخصیات مستنصر کے مشاہدے میں آتی ہیں وہ

اتنی غیر معمولی نہیں ہوتیں کہ اس کی رُوداد کو امتیاز بخشیں۔ جو چیز اس کی تحریر کو پُرکشش اور دلاویز بناتی ہے وہ اس کا خوبصورت اندازِ بیان ہے۔ بعض حصے تو اس قدر چلبلے اور شگفتہ ہیں کہ یہ شخص اگر سارا سفرنامہ اسی انداز میں لکھتا تو ہمارا مزاح کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔

دُعا ہے کہ مستنصر بکثرت "شالا پردیسی تھیوے" تاکہ اُردو ادب میں حسین و جمیل سفرناموں کا اضافہ ہوتا رہے۔ یہ دُنیا مستنصر جیسے لوگوں ہی کے دم سے حسین ہے۔ وہ ملک وہ شہر کس کام کا جہاں کم از کم ایک مستنصر حسین تارڑ نہ ہو۔

ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ ندارد — ضؔ

محبتوں، اذیتوں کی جانب

ہسپانوی ادیب میگوئیل سروانتس اپنے شہرۂ آفاق ناول "ڈان کی خوتے"* کے مرکزی کردار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اُس کے ذہنی خلفشار نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ وہ سوچنے سمجھنے کی قوّتوں سے عاری ہو گیا۔ لاتعداد کتابوں کے مطالعے سے جنم لینے والے منتشر خیالات اور تصورات اس کے دل و دماغ پر بُری طرح حاوی ہو گئے۔ اُس کا ذہن رعنائیوں، فسادوں، جنگوں، مقابلوں، زخموں، شکایتوں، محبتوں، اذیتوں اور اسی قسم کے دیگر ممکنات کی بنیاد کی آماجگاہ بن گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتابوں میں پڑھی ہوئی تمام تخیلاتی داستانیں اُسے مستند تاریخ کی مانند حقائق پر مبنی نظر آنے لگیں۔"

اور یوں ڈان کی خوتے نے مہم جوئی کی "تلاش کی غرض سے سفر پر کمر باندھی۔ اس کا مطمح نظر شجاعت کے کارنامے دکھا کر دنیا سے بُرائی کی قوتوں کا قلع قمع کرنا اور دُکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا۔

میں بھی ایک ایسے ہی سفر پر کمر بستہ تھا مگر شاید میرا ذہنی خلفشار ڈان کی خوتے کی مانند شدید نہ تھا۔ میں نے ہسپانیہ کے بارے میں جو داستانیں پڑھ رکھی تھیں وہ تصوراتی نہیں بلکہ تاریخی حقائق پر مبنی تھیں۔ کی خوتے نے اس مہم جویانہ سفر کے آغاز سے قبل اپنے باپ دادا کی قدیم اور بوسیدہ زرہ بکتر نکال کر پہنی اور میں نے سامان

* DON QUIXOTE

کا تھیلا چند کتابوں، ایک پُرانی پوستین اور دو کیمروں سے پُر کیا اور کاندھے پر ڈال لیا۔ اس نے اپنے لاغر گھوڑے "روزی نانتے" کو ذریعۂ سفر بنایا اور میں بھاپ کے دیو پر سواری کر رہا تھا۔ اُسے شجاعت کے کارنامے دکھانے کے لیے کسی ناقابلِ تسخیر قلعے کی تلاش تھی اور میں...... تسخیر ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ شب بسری کے لیے کسی چرواہے کی جھونپڑی کا متلاشی تھا اور میں...... اپنی جھونپڑی ایک خیمے کی صورت میں کندھوں پر اُٹھائے پھرتا تھا۔

سفر کی مکمل تیاری کے بعد ڈان کے خوتے کو ایک ایسی خاتون کی تلاش ہوئی جس پر وہ اپنا دل نثار کر سکے اور بہادری کے کارنامے سرانجام دینے سے قبل اس کا نام لے کر اپنا نیزہ چوم سکے۔ بقول سروانتس ایک مہم جو شخص محبوبہ کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے ایک درخت پھل اور پتوں کے بغیر۔ چنانچہ ڈان کے خوتے نے ایک دیہاتی دوشیزہ کو اپنی محبوبہ قرار دے کر سفر کا آغاز کر دیا...... میں اس معاملے میں ڈان کے خوتے سے پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ لاہور شہر کی تنگ گلیوں میں اگر محبوبہ کی تلاش کی جائے تو سفرِ مہم جوئی کی بجائے سفرِ آخرت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ڈان کے خوتے کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنے مریل گھوڑے "روزی نانتے" پر سوار ہوا اور اُس کی باگیں مکمل چھوڑ دیں کہ جدھر بھی چاہے چل دے کیونکہ مہم جوئی کا یہی خاصہ ہوتا ہے۔ بھاپ سے چلنے والے جس آہنی دیو پر میں سوار تھا وہ میرے بس میں نہ تھا۔ وہ مجھے پیرس سے سیدھا سان سباستیان لیے جا رہا تھا۔ رعنائیوں کی جانب۔ اذیتوں کی طرف۔ محبتوں کی سمت...... جن کے بارے میں مَیں اب تک صرف کتابوں میں پڑھتا آیا تھا۔

ساری رات ہماری گاڑی فرانس کے وسیع میدانوں اور جنگلوں میں دوڑتی رہی۔ میں نے ڈبے میں سوار مسافروں کا جائزہ لیا۔ ایک غلیظ ہسپانوی مزدور دو راہبائیں،

ایک فرانسیسی جوڑا اور گٹھے ہوئے جسم کی ایک نوجوان عورت جس کا سر نیند کی مدہوشی میں میرے شانے کے ساتھ آلگا تھا۔

ڈبے میں بے پناہ گھٹن تھی۔ تمام مسافر سو رہے تھے مگر نیند مجھ سے کوسوں دور تھی...... مُور کی واپسی۔ رُومیوں نے مغربی افریقہ کو ماریطانیہ کہا اور وہاں کے باشندوں کو مُوری کا نام دیا۔ یہی لفظ ہسپانوی میں مورو کہلایا اور انگریزی میں مُور...... اور پھر تمام مسلمانوں کو بلاتفریق مُور کہا جانے لگا یہاں تک کہ فلپائن کے مسلمان اب بھی مُور کہلاتے ہیں کیونکہ یہ جزائر ایک ہسپانوی میگالن نے دریافت کیے تھے۔ ہسپانوی جو ہر مسلمان کو مُور کہتے ہیں...... غرناطہ سے جلاوطن ہونے کے ۴۰۰ برس بعد ...... ایک پاکستانی مُور کی واپسی...... اپنے وطن اُندلس کی جانب۔

ڈبے میں گھٹن ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی تھی۔ فرانسیسی تازہ ہوا کو سمِ قاتل سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے گھر کی اور دورانِ سفر ٹرین کے ڈبے کی کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر کے سوتے ہیں...... ہسپانوی مزدور منہ کھولے خراٹے لے رہا تھا۔ دونوں راہبائیں بالکل اکڑوں بیٹھی سو رہی تھیں۔ جب کبھی پٹڑی بدلنے سے ٹرین جھولتی تو ان کے سر آپس میں ٹکرا جاتے مگر وہ فوراً سنبھل جاتیں اور پھر اکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

فرانسیسی جوڑا آپس میں گڈمڈ ہو کر سو رہا تھا۔ نوجوان عورت کا سر بدستور میرے شانے پر آرام کر رہا تھا۔ اس کا سانس بے حد گرم تھا۔

"معاف کیجیے گا" میں نے آہستہ سے اپنا شانہ ہلایا۔

"اُوں" عورت نے نیند میں ڈوبی ہوئی دائیں آنکھ کھول کر کہا اور پھر مسکرا کر میرے اور قریب ہو گئی۔

"معاف کیجیے گا میں ڈبے سے باہر جانا چاہتا ہوں" میں نے شانہ جھٹک کر کہا۔

"اُوں۔ ہُوں" عورت نے سر اُٹھایا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی اور پھر کندھے سیکڑ کر بڑے مزے سے دوسری طرف بیٹھے ہوئے ہسپانوی مزدور کے شانے پہ سر رکھ کر سو گئی۔ مزدور کے خراٹے بند ہو گئے۔

میں ڈبے سے نکلا اور ٹرین کی لمبی راہداری میں آکھڑا ہوا۔ یہاں پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور ڈبوں کے آپس میں بھڑنے کا شور تو تھا مگر تمام کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے ہوا میں تازگی تھی۔ میں نے اپنی سفید برساتی کا کالر گلے کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر ایک لمبا سانس لیا۔ ہوا میں گھنے جنگلوں اور سرسبز کھیتوں کی مہک تھی ...... میں لمحہ بہ لمحہ اُندلس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اُندلس جو میرے طویل سفر کی معراج تھا۔ تہران میں گھدیپ چاہتا تھا کہ میں چند روز اور ٹھہر جاؤں۔ میں نے کہا تھا "قرطبہ کی محرابوں اور غرناطہ کے ایوانوں نے مجھے ایک ڈور میں باندھ رکھا ہے۔ میں اس کے آخر میں جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ ڈور کون ہلا رہا ہے" استنبول کی نیلی مسجد میں مجھے مسجد قرطبہ کے ستون یاد آئے۔ سٹاک ہوم میں ماگریتا نے کہا تھا "وہ کونسا ایسا فسوں ہے جو تمہیں سب کچھ چھوڑ کر اُندلس جانے پر مجبور کر رہا ہے؟" "لندن میں میری نظریں جنوب کی سمت ہی لگی رہیں۔ پیرس کی پاسکل کے اپاہج بندھن بھی میرا راستہ نہ روک سکے۔

"بیلیت موسیو!"

میں نے مڑ کر دیکھا تو فرانسیسی ٹکٹ چیکر منہ بنائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جیب سے ٹکٹ نکال کر اس کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان اٹکا دیا۔

"اگلا سٹاپ کونسا ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"تُورز" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور ٹکٹ چھید کر مجھے واپس کر دیا۔

اُس کے جانے پر میں نے اپنی کہنیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا دیں اور باہر دیکھنے لگا۔ ہر شے تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی ...... جنگل ہوا میں خوشبو تھی۔ خوشبو اپنے وطن کی ...... تورز قریب آ رہا تھا۔ تورز۔ جہاں جبل الطارق سے بچھڑنے کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کی طوفانی لہر مدھم ہوئی اور پھر ہموار ہو کر زمین پر بچھ گئی۔ "مسلمان ہسپانیہ اور پرتگال فتح کرنے کے بعد فرانس کے ایک بڑے حصے پر بھی قابض ہو گئے۔ گبن لکھتا ہے "دمشق اور سمرقند کے سلطان کی افواج گاسکنی کے انگوروں کے باغات اور بورڈے کے شہر سے بھی آگے نکل گئیں۔ یہاں تک کہ فرانس کے جنوبی حصے نے دریائے گیرون سے دریائے رہون تک مسلمانوں کے عادات و اطوار اپنا لیے"

اُندلس کے اُموی گورنر عبدالرحمان الغافقی نے ۷۳۲ء کے موسم بہار میں بلند کوہ پیرانیز عبور کیے اور دریائے گیرون کے کنارے ڈیوک آف یوڈس کو شکست دینے کے بعد بورڈے پر حملہ آور ہوا۔ بورڈے کے بعد پامرڈ سرنگوں ہوا اور مسلمان افواج تورز کی جانب بڑھیں جہاں یورپ کی نیم وحشی افواج چارلس مارٹل کی زیر قیادت صف آرا تھیں۔ مارٹل کے سپاہیوں نے اپنے بدن بھیڑیوں کی کھالوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور ان کے بے تحاشہ بڑھے ہوئے بال کندھوں سے نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ لڑائی شروع ہونے کے ساتویں روز الغافقی میدانِ جنگ میں کام آیا۔ عرب بقول انتھونی نٹنگ ایک زیرک راہنما کی سرکردگی میں آسمان کی بلندیاں چھو لیتے ہیں مگر اس کی غیر موجودگی انہیں ذلت کی گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ الغافقی کے مارے جانے پر عرب بددل ہو گئے۔ اس شب ان کے خیموں میں زمانۂ جاہلیت کے قبائلی جھگڑوں نے پھر سر اُٹھا لیا یمنی، نجدی، حجازی اور شامی متفقہ طور پر کسی ایک شخص کو قائد تسلیم کرنے میں ناکام ہو گئے۔ انھوں نے اپنے خیمے سمیٹے اور رات کی تاریکی میں روپوش ہو گئے۔ گبن لکھتا ہے "اگر مسلمانوں کی

فتوحات کا سلسلہ یونہی جاری رہتا تو فرات اور نیل عبور کر لینے والی قوم کے لیے دریائے رائن پار کر لینا چنداں دشوار نہ تھا۔ ان کا بحری بیڑا بڑی آسانی سے دریائے ٹیمز میں داخل ہو جاتا۔ جنگِ تورز میں عیسائیوں کو شکست ہو جاتی تو آج آکسفورڈ میں بائبل کی بجائے قرآن پڑھایا جاتا اور کلیسا سینٹ پیٹرز پر صلیب کی بجائے ہلال نصب ہوتا۔ غلپ حتی اس جنگ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ لکھتا ہے "جنگِ تورز کسی صورت میں بھی فیصلہ کن نہ تھی۔ کیونکہ صرف دو سال بعد مسلمانوں نے ایویان اور نو سال بعد لی آن جیسے مشہور فرانسیسی شہر روند ڈالے۔ پھر نارلون کی باری آئی جہاں سے گرفتار کئے گئے عیسائی مسجد قرطبہ کی تعمیر پر لگائے گئے۔"

رات کے پچھلے پہر تورز آیا...... میرے ڈبے کا دروازہ کھلا اور وہ جوان عورت آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"تورز؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے سر ہلا دیا۔

"بون وائج" اس نے شرارت سے لب سکیڑے اور ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم سے پرے تاریکی میں گم ہو گئی...... اس کا سر میرے شانے کے ساتھ آ لگا تھا...... مسلمان تورز تک آ پہنچے تھے...... وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر تاریکی میں گم ہو چکی تھی...... یورپ مسلمانوں کے قدموں میں تھا اور پھر ایک خواب تاریکی میں جذب ہو گیا...... انجن نے وہسل دی اور گاڑی رینگنے لگی۔ بالکل آہستہ آہستہ جیسے آج سے پورے ۱۲۳۷ برس پیشتر مسلمان ایک سیاہ رات میں تورز سے روپوش ہو گئے تھے......

گاڑی سٹیشن سے باہر نکلی تو مجھے احساس ہوا کہ عربوں کے اندلس کی حدود یہاں سے شروع ہوتی تھیں۔ ان کی آمد سے قبل ہسپانیہ کا ایک صوبہ وہاں بسنے والی قوم ونڈال (   ) کی مناسبت سے وانڈلُسیا یعنی ونڈالوں کا مسکن

کہلاتا تھا جو بعد میں بگڑ کر اندلسیا ہوا اور پھر اندلس میں بدل گیا۔ عرب ان تمام علاقوں کو اندلس کہتے تھے جو آج کل ہسپانیہ، پرتگال اور جنوبی فرانس کے اس حصے میں جہاں میری گاڑی جا رہی تھی شامل ہیں۔

زرد رو راہباؤں کی انگلیوں میں تسبیح کے دانے پھسل رہے تھے۔ فرانسیسی جوڑا اپنے شکن آلود لباس درست کر رہا تھا اور ہسپانوی مزدور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجلانے کے ساتھ ساتھ ایک پیاز کھانے میں مصروف تھا۔ صبح ہو چکی تھی اور ہم ہسپانیہ کے سرحدی قصبے ایرون میں داخل ہو رہے تھے۔ کسٹم کی چیکنگ خاصا صبر آزما مرحلہ تھا۔ میں فرانس سے ہسپانیہ میں داخل ہونے والے سیاحوں کی ایک طویل قطار میں اپنے سامان کا تھیلا کندھے پر ڈالے پلیٹ فارم پر کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔ میری باری آئی تو کسٹم آفیسر نے سامان کھولنے کو کہا۔ میں نے اپنے تھیلے کی گرہ کھول کر اسے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کسٹم آفیسر نے تھیلے میں رکھی کتابوں پر ایک نظر ڈالی۔ "مورز ان سپین" "اوہ! مورش سپین" "الحمرا کی کہانیاں" اس نے باقاعدہ منہ بنا لیا اور میرے پاسپورٹ پر مہر لگا کر مجھے فارغ کر دیا۔ میرے پیچھے دو امریکی لڑکیاں کھڑی تھیں جنہیں کسٹم آفیسر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سامان کی تلاشی تو درکنار اس نے ان کے پاسپورٹوں پر مہر لگانے کے بعد ان کو سیلوٹ بھی کیا۔ لڑکیاں خوش شکل تھیں اور ہسپانوی چاہے زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہو قدرتی طور پر حسن پرست ہوتا ہے۔ کسٹم سے فارغ ہو کر میں دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک ہسپانوی گاڑی میں سوار ہو گیا جو سان سباستیان تک جا رہی تھی۔ ڈبے میں ایرون کے گرد و نواح میں رہنے والے مزدوروں کا بے پناہ ہجوم تھا جو صبح سویرے سان سباستیان کے کارخانوں میں کام کرنے جا رہے تھے۔ ان کا لباس اور جسمانی صحت کا معیار اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ ہسپانیہ یورپ کا غریب ترین ملک ہے۔ گاڑی کی رفتار بے حد آہستہ تھی۔ ریلوے لائن کے پہلو میں واقع عمارتوں کی سفیدی اتری ہوئی تھی اور جا بجا پلستر کے اکھڑ جانے

سے اینٹھیں نظر آ رہی تھیں گزشتہ شب سفر کا بیشتر وقت راہداری میں کھڑے ہو کر گزرا تھا، اس لیے اب نیند آ رہی تھی۔ میں کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔

"دیکھیے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہم آپ کے ساتھ بیٹھ جائیں؟" میں نے بمشکل اپنی نیند سے بھاری آنکھیں کھولیں تو سامنے ہسپانوی کسٹم آفیسر کی پسندیدہ امریکی لڑکیوں کو کھڑے پایا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں کھسک کر کھڑکی کے ساتھ لگ گیا۔ اور وہ فوراً میرے برابر والی نشست پر براجمان ہو گئیں۔

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی پستہ قد اور قابلِ رشک صحت کی مالک لڑکی نیلے رنگ کی چست پتلون اور کالے سویٹر میں ملبوس تھی۔ سویٹر لمبائی میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے پتلون تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ وہ بار بار سویٹر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر سویٹر اور پتلون کے درمیانی فاصلے کو پُر کرنے کی کوشش کرتی مگر ہاتھ اُٹھاتے ہی جسم کے بالائی حصے کے کھچاؤ کی وجہ سے سویٹر سُکڑ کر پھر اپنی پرانی حالت پر آ جاتا اور پتلون کی بیلٹ کے عین اوپر اس کا سفید پیٹ نظر آنے لگتا۔ دوسری لڑکی نے جس کا چہرہ قد سے لمبوترا تھا اپنے کندھوں پر ایک جھینا شال اوڑھ رکھی تھی۔

"دراصل ہمیں ان ہسپانوی مزدوروں نے بے حد تنگ کر رکھا تھا۔" پستہ قد لڑکی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"بلکہ......" دوسری نے اپنے جسم کا ایک حصہ سہلاتے ہوئے منہ بنا لیا۔ "چٹکیاں بھی لیتے تھے۔"

ڈبے کے ایک کونے میں چند ہنس مکھ نوجوان ہسپانوی مزدور کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ لڑکیوں کو میرے پاس بیٹھے دیکھ کر انھوں نے خوب ہا ہُو مچائی۔

"ویسے ان کا قصور نہیں۔" پستہ قد لڑکی نے ہنس کر کہا۔ "موسمِ گرما میں لاکھوں سویڈش لڑکیاں ہسپانیہ میں وارد ہوتی ہیں اور ان کے مقاصد اتنے نیک نہیں ہوتے۔"

انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ "یورپ ریل پاس" پر سفر کر رہی ہیں جو ایک ماہ کے لیے یورپ کے تمام ممالک میں غیر معینہ سفر کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ یہ پاس صرف امریکی، جاپانی اور کینیڈین باشندوں کو ہی مل سکتا ہے۔ میں یورپ میں ایسے بے شمار امریکیوں سے ملا تھا جو "یورپ ریل پاس" پر سفر کر رہے تھے۔ وہ اپنے سفر کے اوقاتِ کار کچھ یوں ترتیب دیتے تھے کہ صبح سویرے کسی بڑے شہر میں وارد ہوئے، پورا دن وہاں گزارا اور پھر کسی ایسی گاڑی میں سوار ہو گئے جو تمام رات چلنے کے بعد صبح سویرے تک کسی اور خوبصورت شہر تک لے جائے۔ یوں وہ ہوٹلوں میں رہائش کا خرچہ گاڑیوں میں سو کر بچا لیتے تھے۔ اگر ایک ہی شہر میں دو تین روز قیام کرنے کا ارادہ ہوا تو پھر ہر شام سٹیشن پر جا کر کسی بھی سمت جاتی ہوئی گاڑی پر سوار ہو کر سو گئے نصف شب کہیں اُتر گئے اور مخالف سمت سے آتی ہوئی کسی اور گاڑی میں بیٹھ کر مزے سے سوتے ہوئے صبح سویرے واپس اُسی شہر میں پہنچ گئے۔

ایرون سے سان سباستیان تک سفر چالیس منٹ میں طے ہُوا۔ دورانِ سفر ہسپانوی مزدور بڑی باقاعدگی سے لڑکیوں کو گھورتے رہے اور ان پر فقرے کستے رہے۔

گاڑی کھڑی ہوئی تو میں نے اپنا سامان کندھے پر رکھا اور پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ مجھے بے حد بھوک لگ رہی تھی اور میری جیب میں پھوٹا پیسہ بھی نہ تھا۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے سفری چیک ہسپانوی کرنسی پیسیتہ میں تبدیل کروانے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ کامبیو یعنی کرنسی کا تبادلہ ریلوے سٹیشن میں واقع بانکو یعنی بینک سے ہو گا اور بینک نو بجے کھلے گا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف سات بجے تھے چنانچہ میں ریلوے سٹیشن کے ایک کونے میں سامان کا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی میں اونگھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ امریکی لڑکیاں پھر وارد ہو گئیں۔

"اب آپ کو کون تنگ کر رہا ہے؟" میں نے وہیں لیٹے لیٹے دریافت کیا۔

"کوئی بھی نہیں!" پستہ قد لڑکی نے اپنا کالا سویٹر کھینچتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "ہم صرف یہ پوچھنا چاہتی ہیں کہ ہسپانوی کرنسی کہاں سے مل سکتی ہے؟"

"تشریف رکھیے۔" میں نے چکیلے فرش پر ہتھیلی رکھ کر کہا۔ "ہسپانوی کرنسی سٹیشن کے بانکو سے ملے گی اور بانکو نو بجے کھلے گا۔" چنانچہ انھوں نے بھی میری تقلید کی اور سامان سر کے نیچے رکھ کر اُونگھنے لگیں۔

نو بج گئے مگر بانکو نہ کھلا۔ سٹیشن اب بالکل خالی پڑا تھا سوائے ایک خاکروب کے جو پچھلے دو گھنٹوں سے فرش کا ایک کونہ چمکار رہا تھا۔ میں اُٹھ کر اُس کے پاس چلا گیا۔

"سینیور!" میں نے خالی کاؤنٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بانکو کتنے بجے کھلتا ہے؟"

اس نے منہ بچلا کر فرش پر تھوکا اور پھر اس پر کپڑا جما کر کہنے لگا۔ "کامبیو؟"

میں نے سر ہلا دیا۔ "ہاں چینج!"

"نو کامبیو! نو بانکو! دومنگو!" اس نے گردان کی اور پھر سر جھکا کر فرش کو شیشہ پالش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

پہلے دو لفظ تو میں ٹکٹ چیکر کی مہربانی سے سیکھ چکا تھا مگر اب یہ دومنگو جانے کس بلا کا نام تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام ہسپانوی الفاظ کے آخر میں "و" ضرور آتا تھا۔ میں نے فوراً کوٹ کی اندرونی جیب سے لندن سے خریدی ہوئی ہسپانوی، انگریزی ڈکشنری نکالی۔ دومنگو۔ دومنگو۔ میں نے لفظ دہراتے ہوئے جلدی سے ورق اُلٹے۔ معلوم ہوا کہ دومنگو ہسپانوی میں اتوار کو کہتے ہیں۔

ہسپانیہ میں میری پہلی صبح کچھ اتنی دلآویز ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک سٹیشن سے باہر چمکتی دھوپ سے بھی زیادہ چمک رہی تھی۔ جیب میں ایک پیستہ نہ تھا اور کہیں سے ملنے کا امکان تھا کیونکہ آج اتوار تھا اور ظاہر ہے اتوار کو تمام

بینک بند ہوتے ہیں۔

میں نے واپس آ کر امریکی خواتین کو جب یہ دومنگو والا مژدہ سنایا تو ان کے چہرے بھی لٹک گئے۔ وہ بھی میری طرح "پھانک" تھیں۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لمبوترے منہ والی نے شہادت کی انگلی کھڑی کر دی۔ "اکثر بڑے ہوٹلوں میں گاہک کی سہولت کے لیے کرنسی تبدیل کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔"

"بڑے ہوٹلوں میں؟" میں نے اپنی ہیئت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ بات بھی ہے۔" پستہ قد لڑکی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ہم تینوں کے میلے کچیلے اور پُرشکن لباس دیکھ کر شاید کوئی نچلے درجے والا ہوٹل بھی ہمیں اندر گھسنے کی اجازت نہ دیتا۔ لمبوترے منہ والی کی آنکھوں میں "گیڈ" بھی لگی ہوئی تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"بہر حال اب تو یہی طریقہ ہے۔" میں نے اپنا تھیلا اٹھاتے ہوئے کہا۔ اُن دونوں نے بھی اپنا سامان اُٹھا لیا اور ہم سٹیشن سے باہر آ گئے۔

سان سباستیان کی سفید عمارتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ شاید رات کو بارش ہوئی تھی۔ سڑکوں پر کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ شہر کے درمیان میں ایک نہر بہہ رہی تھی جس کے دونوں کناروں پر سرسبز درختوں کی قطاریں تھیں۔ ہم ایک خوبصورت پل پار کر کے دوسرے کنارے پر چلے گئے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہسپانوی طرز کی سفید آہنی بالکونیوں اور شیشے کی بڑی فرانسیسی کھڑکیوں والا ایک ہوٹل نظر آیا۔ ہم نے چپکے سے صدر دروازہ کھولا اور ہوٹل کے وسیع باغ میں سامان رکھ کر بڑے ٹھسے سے اندر داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کالے سوٹ میں ملبوس ایک گنجا آدمی بڑے انہماک سے نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ ہم نے بڑی عاجزی سے اپنا مُدعا بیان کیا تو اس نے فوراً نوٹ سمیٹ کر کاؤنٹر کے نیچے

رکھ لیے اور پھر کسی قدیم گھڑیال کے پینڈولم کی طرح سر ہلانے لگا "یہ کرنسی صرف ہوٹل میں قیام پذیر گاہکوں کے لیے تبدیل کی جا سکتی ہے۔"

کمبخت اصلی ہسپانوی نہیں لگتا تھا کیونکہ میری ساتھی امریکی لڑکیوں نے نہ صرف اپنی مسکراہٹوں کا آزادانہ استعمال کیا بلکہ پستہ قد لڑکی نے اپنے برہنہ پیٹ کو سویٹر کھینچ کر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کی۔ ہم مایوس ہو کر باہر آنے کو تھے کہ میری نظر ڈائننگ روم میں بیٹھی دو انگریز بوڑھیوں پر پڑی جو چائے پینے میں مشغول تھیں۔ انگریز اس لیے کہ یورپ میں چائے پینے کا تردد صرف یہی قوم کرتی ہے۔ میں ڈائننگ روم کا دروازہ کھول کر ان کے پاس چلا گیا۔ نہایت رونی شکل بنا کر اپنی بپتا سنائی اور ان سے التجا کی کہ وہ ہوٹل میں مقیم گاہکوں کی حیثیت سے ہمیں کرنسی تبدیل کرانے میں مدد دیں۔

"ورنہ دے کہیں کے۔" ایک مائی نے چائے کی پیالی میز پر پٹخ دی۔

"ظالم ہسپانوی" دوسری مائی بسکٹ کھاتے ہوئے اپنا پوپلا منہ چلانا بھول گئی اور وہ دونوں فوراً اٹھ کر میرے ساتھ کاؤنٹر پر چلی آئیں۔

"ان بے چارے بچوں کے پاس خوراک خریدنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں اور تم ان کے لیے کرنسی تبدیل نہیں کرتے پیڈرو کے بچے!"

"لیکن سوائے گاہکوں کے......" پیڈرو کے بچے نے لرزتے ہوئے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"کیا ہم گاہک نہیں ہیں جو پچھلے بیس روز سے تمہارے اس اصطبل میں قیام پذیر ہیں؟ کیوں ایملی ڈیئر؟"

"ہاں باربرا ڈیئر۔ اور بیس روز میں سے سولہ دن بارش ہوتی رہی ہے۔"

پوپلی مائی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور ہمیں اس پیڈرو کے بچے نے یہ کہہ کر ٹھہرایا تھا کہ اگست کے ان دنوں میں

یہاں موسم خوشگوار رہتا ہے اور سورج چمکتا رہتا ہے۔ کیوں ایملی ڈیئر!"

"ہاں باربرا ڈیئر۔ اس سے بہتر تھا کہ اپنی چھٹیاں لندن میں ہی گزار لیتیں۔"

"اور آج صبح ناشتے میں دیے گئے انڈے کم از کم دو منٹ تک اُبلتے رہے ہوں گے۔ حالانکہ میں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میرا انڈا صرف پونے دو منٹ تک اُبالا جائے۔ کیوں ایملی ڈیئر؟"

"جی وہ کرنسی......" اس سے قبل کہ ایملی ڈیئر اپنے جلے ہوئے ٹوسٹ کا رونا روتی میں نے کرنسی کا رونا رو دیا۔

"او ہو ہم تو بھول ہی گئی تھیں" دونوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا اور پھر قہر آلود نگاہیں جما کر کہنے لگیں۔ "پیڈرو!"

پیڈرو وہیں منجمد ہو گیا "جی میڈم"

"ان بچوں سے سفری چیک لے کر انہیں ہسپانوی پیسیتے دے دو۔"

"جی میڈم" پیڈرو نے کھٹ سے کہا اور فوراً ہم تینوں سے سفری چیک وصول کر کے ہمیں ہسپانوی پیسیتوں سے لاد دیا۔ ہم مائیوں کا شکریہ ادا کر کے ہوٹل سے باہر جانے والے تھے کہ ایملی ڈیئر نے ہمیں چائے کے لیے مدعو کر لیا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا لمبوترے منہ والی نے "اوہ بہت بہت شکریہ" کہہ کر دعوت قبول کر لی۔

"باربرا ڈیئر" پوپلی مائی کرسی پر بیٹھتے ہی اپنی سہیلی سے مخاطب ہوئی۔

"کیا ہے ایملی ڈیئر؟" دوسری مائی نے ہمارے لیے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے آج ناشتے پر صرف ٹوسٹ اور مکھن کھایا تھا؟"

"پھر؟" مائی نے بسکٹوں کی پلیٹ لڑکیوں کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر تو انڈا پونے دو منٹ کی بجائے دو منٹ میں اُبلا ہوا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہاں یہ تو ہے" مائی نے اپنا بگلا سر کھجلایا اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی "مگر پچھلے

ہیں ، ڈز میں سولہ دن بارش بھی تو نہیں ہوئی ۔ ہم تو صرف دس روز سے یہاں مقیم ہیں ۔"

"ہاں یہ بھی ہے ۔" پوپلی مائی ہنس دی اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "میرا خیال ہے ہم بوڑھی ہو چلی ہیں ۔"

جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو ہماری جیبیں پیسیتوں کے بوجھ سے اور ہمارے پیٹ جائے اور بسکٹوں سے بوجھل ہو رہے تھے ۔ پستہ قد لڑکی کا سویٹر مزید سکڑ چکا تھا ۔

"اب کیا ارادہ ہے ؟" پستہ قد لڑکی نے اپنی ساتھی سے دریافت کیا ۔

"مجھے تو سان سباستیان سے وحشت ہونے لگی ہے ۔ سٹیشن پر آویزاں ٹائم ٹیبل کے مطابق بارہ بجے ایک گاڑی میڈرڈ کے لیے روانہ ہوتی ہے ۔ اسی پر سوار ہو کر میڈرڈ چلے چلتے ہیں ۔ راستے میں سو بھی لیں گے ۔"

"ایک رات کے لیے سان سباستیان میں رُک جائیں تو کیا حرج ہے ؟" سویٹر والی لڑکی نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ۔

"ہاں کوئی حرج نہیں مگر پھر میں اکیلی کیا کروں گی ؟"

لمبوترے مُنہ والی نے ہنس کر کہا ۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ۔" دوسری لڑکی نے اپنا کالا سویٹر پتلون کے اُوپر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے مایوسی سے سر ہلایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی ۔

"اگر یہاں تمھارا کوئی اور دوست ہو تو آج شب ہم چاروں ......"

"یہاں سان سباستیان میں ؟" میں بے اختیار مسکرا دیا ۔ "بہر حال پیش کش کا شکریہ ... خدا حافظ !" میں نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور سامان اٹھا کر شہر کی جانب چل دیا ۔

"میڈرڈ میں ملاقات ہوگی ۔" کالے سویٹر والی کی آواز مجھ تک پہنچی ۔ میں نے پیچھے دیکھے بغیر اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کر دیا ۔

دس بج چکے تھے مگر سان سباستیان کے خالی کوچہ و بازار دیکھ کر خیال آتا تھا کہ شاید یہاں کے باشندوں کو ابھی تک طلوعِ آفتاب کا علم نہیں ہُوا ۔ میں

نے سامان کے تھیلے میں سے "یوتھ ہوسٹل بُک" نکال کر سان سباستیان کے یوتھ ہوسٹل کا پتہ تلاش کیا اور پھر شہر کے مرکز کی جانب چلنا شروع کر دیا جہاں سے مجھے ہوسٹل تک جانے والی بس ملنی چاہیے تھی ۔ پلازا میئر سے ساحل کی جانب جاتی ہوئی سڑک کے دو رویہ درختوں کی قطاریں تھیں جن کے تلے چوڑے فٹ پاتھ پر قہوہ خانوں کے ملازم کرسیاں اور میزیں سجا رہے تھے ۔ کارپوریشن کا ایک ٹرک سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا تھا ۔ کافی تلاش کے باوجود مجھے مطلوبہ بس سٹاپ نہ مل سکا ۔ فٹ پاتھ پر کالے بالوں والی دو پستہ قد ہسپانوی لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی ہوئی چلی آ رہی تھیں ۔ میں نے انھیں روک کر یوتھ ہوسٹل جانے والی بس کے بارے میں دریافت کیا ۔ وہ دونوں پہلے تو خاموش رہیں اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں ۔ میں نے دوبارہ اپنا مدعا بیان کیا ۔

"فرانجیس" اُن میں سے ایک نے انگلیاں نچا کر کہا اور پھر دونوں اُسی طرح ہنستی ہوئی آگے چل دیں ۔ ایک خوش لباس راہگیر جس نے شاید مجھے لڑکیوں سے باتیں کرتے دیکھا تھا میرے پاس آ کر نہایت شستہ انگریزی میں کہنے لگا "کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں ؟" میں نے بس سٹاپ کے بارے میں پوچھا تو وہ میرے ساتھ ہو لیا ۔

"میں بھی اُسی جانب جا رہا ہوں ۔ میرے ساتھ چلے آئیے ۔ آپ شاید یورپ کی سیاحت کے بعد ہسپانیہ آ رہے ہیں" وہ کہہ رہا تھا ۔ "اسی لیے راہ چلتی لڑکیوں سے راستہ دریافت کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے ۔ ہسپانیہ میں یہ بات انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہے ۔ ہم شمال میں رہنے والے اگرچہ جنوب کے نیم وحشی اندلسیوں وغیرہ سے زیادہ تہذیب یافتہ ہیں مگر پھر بھی ہم ان نازک معاملوں میں اپنے ہمسائے فرانس کی تقلید نہیں کرنا چاہتے ۔ ویسے بھی ......" اس نے اپنے دونوں لب سختی سے بھینچ کر کہا "ہم باسک ہسپانوی نہیں ہوتے ۔"

"باسک !" میں نے اس کے چوڑے چکلے سینے اور سنہری بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا "باسک کون ہوتے ہیں ؟"

اُس کے قدم وہیں رُک گئے اور وہ میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کوئی عظیم گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

"آو کسے ماریا" اس نے فوراً اپنا چھاتا بائیں ہاتھ میں منتقل کیا۔ پوتر مریم کا نام لے کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر کہنے لگا "باسک ایک ایسی نسل کا نام ہے جس کے خون میں ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہے۔ یورپ کی اعلیٰ ترین نسل ہسپانیہ میں رہنے والے تمام باشندوں کی رگوں میں تو کافر عربوں کے خون کی آمیزش ہے لیکن کوہ پیرانیز کے دامن میں بسنے والی ہماری قوم ہزاروں سال سے اپنے پوتر خون کی حفاظت کر رہی ہے۔ باسک جتنا محنتی، صحت مند اور مذہبی شخص آپ کو دنیا بھر میں نہ ملے گا۔ ہسپانیہ میں اگر کسی کو ایک ایماندار اور محنتی مزدور کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کہتا ہے "ایک باسک لے آؤ" ہم اپنی تمام زمینیں اجتماعی طور پر کاشت کرتے ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد تمام جائداد بڑے بیٹے کے نام منتقل ہو جاتی ہے جو پورے خاندان کی ضروریات پوری کرتا ہے اور اسی لیے ہم ان ہسپانویوں سے زیادہ خوشحال ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ ہمارا تقابل سکاٹ لینڈ کے باشندوں کے ساتھ کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ ہم ان کی طرح اچھے کاریگر تو ہیں مگر کنجوس بالکل نہیں ...."

"وہ یوتھ ہوسٹل کو جانے والی بس کا شاپ ......" میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"بس شاپ؟ ہاں بس شاپ" اس نے چلنا شروع کر دیا مگر لیکچر پھر بھی جاری رہا "ہسپانوی لوگ اور مرکزی حکومت ہمیشہ ہمیں شک کی نظروں سے دیکھتی ہے ...... وہ آنکھ میچ کر مسکرا دیا "اور ان کی تشویش بجا ہے۔ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہماری زبان، ہماری رسم و رواج اور عادات کا باقی ہسپانیہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ آزادی کی تحریک شروع ہے۔ پیرانیز کے پار فرانس میں رہنے والے

باسک بھی ہماری مدد کر رہے ہیں۔ اگرچہ مرکزی حکومت نے تحریک آزادی کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر رکھا ہے مگر ہم ایک نہ ایک دن آزاد باسک ریاست بنانے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔"

بس شاپ آنے تک اُس بھلے آدمی نے سوائے باسک نسل کی بڑائی اور عظمت کے کارنامے بیان کرنے کے اور کوئی بات نہ کی۔ بس آئی تو اس نے خاص طور پر کنڈکٹر کو ہدایت کی کہ وہ مجھے یوتھ ہوسٹل کے شاپ پر اتار دے۔

"اور ہاں" اس نے بس کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ جب فرانس کا بادشاہ شارلیمان کوہ پیرانیز عبور کر کے ہسپانیہ پر حملہ آور ہوا تو یہ باسک ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر درہ رانسے وُو میں اس کا بھرکس نکال دیا۔"

خوش قسمتی سے کنڈکٹر نے فوراً ہی وہسل دے دی۔ اور میں باسک نسل کی عظمت کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی سعادت سے محروم ہو گیا۔

سان سباستیان کا یوتھ ہوسٹل شہر سے باہر ایک ہرے بھرے پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ میں نے داروغہ کے پاس اپنا کارڈ جمع کروایا اور اندر چلا گیا۔ کمرے میں چھ بستر تھے جن میں سے ایک پر نکیلی مونچھوں والا ایک نوجوان لڑکا سو رہا تھا۔ میں کپڑے بدلنے کی نیت سے سامان کا تھیلا کھولنے کو تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی ایک ہاتھ میں لمبا برش اور دوسرے میں پانی کی بالٹی تھامے ہوسٹل کے کمرے صاف کرنے والی ایک محترمہ کمرے کے اندر آ گئی۔ اس نے بالٹی زمین پر پٹخی، میری طرف دیکھ کر ناک چڑھائی اور انگوٹھے کو خم دے کر دروازے کی طرف اشارہ کر دیا یعنی باہر دفع ہو جاؤ۔ میں کمرے سے باہر آیا تو وہ نکیلی مونچھوں والا نوجوان بھی آنکھیں ملتا میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"کیا آپ بھی ہسپانیہ کی سیاحت پر نکلے ہوئے ہیں؟" میں نے یونہی پوچھا۔

"نہیں نہیں" اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "میں

تو سان سباستیان میں ہی رہتا ہوں۔ اتوار کے روز میری بیوی میکے چلی جاتی ہے اور ہمارے آٹھ بچے گھر میں وہ اُدھم مچاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ چنانچہ میں ہوسٹل میں آکر سو جاتا ہوں۔ یہاں سوائے اس کمرے صاف کرنے والی کے اور کوئی میرے سکون میں مخل نہیں ہوتا۔ پوپ اگر خاندانی منصوبہ بندی کی اجازت دے دیتا تو میری زندگی یوں اجیرن نہ ہوتی۔ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"میں غیر شادی شدہ ہوں۔!"

"کسی کیتھولک لڑکی سے شادی مت کر بیٹھنا۔ ہاں!" اس نے اونگھتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔

اُدھر وہ ہسپانوی چوڑی کمرے کی صفائی پر دھیان دینے کی بجائے اپنے گلے کے کمال کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھی۔ بستر تو واجبی طور پر جھاڑتی مگر منہ کھول کر تانیں خوب لگاتی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب اس کا گلا بیٹھنے لگا اور "لا۔ لا" کی بجائے "لا ہا آ آ" کی آوازیں برآمد ہونے لگیں تو اس نے کمرے کی صفائی مکمل ہونے کا اعلان کر کے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں اپنے بستر پر بیٹھ کر سامان کھولنے لگا تو وہ ایک سٹول کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ کہاں سے آئے ہو؟ کتنے روز ٹھہرو گے؟ ایک سگرٹ تو پلاؤ۔ سگرٹ دیا تو اپنے بچوں اور خاوند کے بارے میں تفصیلات بتانے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے رخصت کیا اور کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دو بج رہے تھے۔ شہر جانے کے لیے تیار ہُوا تو تیکھی مونچھوں والے صاحب کی آنکھ بھی کھل گئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"شہر کی جانب"

"شہر؟" اس کی جمائی وہیں منجمد ہو گئی اس وقت۔ دو بجے؟ یہ تو سستانے کا

وقت ہے۔ سی اِستا!"

"سان سباستیان دیکھنے کے لیے میرے پاس صرف آج کا دن ہے۔" میں نے سودی کیمرہ گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں شاید کل صبح پامپلونا چلا جاؤں۔"

"گرمی بہت ہے۔ بہرحال ساحل کی جانب چلے جاؤ وہاں خوب رونق ہوگی۔ سوئمنگ کاسٹیوم بھی ساتھ لیتے جانا۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنا سوئمنگ کاسٹیوم جو سویڈن کی ایک جھیل میں تر ہونے کے بعد اب تک پڑا سوکھ رہا تھا ایک تولیے میں لپیٹ کر بغل میں دبا لیا اور ہوسٹل کے باہر کھڑی ہوئی بس پر سوار ہو کر سان سباستیان کے مشہور ساحل سمندر کونچا کے قریب اُتر گیا۔

تیکھی مونچھوں والا درست کہتا تھا۔ یہاں خاصی رونق تھی۔ چند ایک ہسپانوی لڑکیاں ریت پر بیٹھی سوئٹر بُن رہی تھیں اور وہ نہانے کے لباس کی بجائے اپنے روزمرہ کے لباس میں ملبوس تھیں۔ البتہ خوش شکل ہسپانوی لڑکوں کی ٹولیاں شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ اور شکار فرانسیسی لڑکیاں تھیں جو نہانے کا مختصر ترین لباس بکینی زیب تن کیے ریت پر لیٹی اپنے متناسب جسم سنولا رہی تھیں۔ بکینی چار گرہ کپڑے کے ان دو ٹکڑوں کا نام ہے جو ستر پوشی کے اصول سے وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو حال اچھا ہے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جسم کے ایک حصے میں اور دوسرے پر اٹکا لیے جاتے ہیں۔ بکینی کے بالائی حصے کی پتلی ڈوری کی گرہ شاید صرف قوتِ ارادی کی بنا پر قائم تھی ورنہ اس میں سوت کی مضبوطی کا چنداں دخل نہ تھا۔ چند برس پیشتر مذہبی وجوہات کی بنا پر ہسپانیہ کے ساحلوں پر اس قسم کا لباس پہننے پر کڑی پابندی عاید تھی۔ خلاف ورزی کرنے والے کو بلکہ والی کو ہسپانیہ کی پولیس "گاردیا سول" دھر لیتی اور جرمانے کے ساتھ دیس نکالا بھی ملتا۔ اس پابندی کا اثر یہ ہُوا کہ سکینڈے نیویا اور فرانس کی آزاد منش سیاح خواتین نے اپنے جسم کا زیادہ تر

حصہ سولانے کی خاطر ہسپانیہ کی بجائے اطالیہ اور یونان کے ساحلی مقامات کی جانب رُخ کرنا شروع کر دیا۔ ان ہر دو ممالک میں لباس پر ایسی کوئی پابندی عاید نہ تھی بلکہ وہاں کے نوجوان لباس اور زیبِ تن کے درمیان زیب کی غیر موجودگی زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ مالی مصلحتوں نے مذہبی جذبات پر غلبہ پایا اور حکومتِ ہسپانیہ نے یہ پابندی اُٹھالی۔ اب غیر ملکی لڑکیاں صرف دو ڈوریاں نیچے اُوپر اٹکا کر کھلے بندوں ساحل پر دھوپ سینکتی ہیں اور ان ڈھکی اَن ڈھکی لڑکیوں کو دیکھ کر ہسپانوی نوجوان اپنی آنکھیں گرماتے ہیں۔

میں سڑک کے ساتھ سیڑھیوں سے اُتر کر ساحل پر آیا اور پھر حفاظتی بند کے ساتھ ایک لکڑی کے کھوکھے میں لباس تبدیل کر کے سمندر کے قریب ریت پر لیٹ گیا۔ سمندر ایک آبنائے کی صورت میں شہر کے درمیان کونچا بیچ تک چلا آیا تھا۔ آبنائے کے دونوں سروں پر اگلڈو اور اُرگل نامی دو سرسبز پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان سانتا کلارا کا خوبصورت جزیرہ دکھائی دے رہا تھا جس کی چھوٹی سی بندرگاہ میں مچھیروں کی چند کشتیاں جھول رہی تھیں۔ اگلڈو پہاڑی پر واقع قلعہ کے حفاظتی بُرجوں کا رُخ سمندر کی جانب ہے اور یہ ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جب بحری قزاق سان سباستیان پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔

سان سباستیان ہسپانیہ کے صوبے باسک کے علاوہ ملک کا گرمائی صدر مقام بھی ہے۔ گرمیوں میں جب میڈرڈ تپنے لگتا ہے تو آبادی کی اکثریت سان سباستیان کا رُخ کر لیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرمیوں میں صرف وہی لوگ میڈرڈ میں رہ جاتے ہیں جو سان سباستیان .... جانے کی توفیق نہیں رکھتے۔ شہر کی فرانسیسی طرز کی عمارتوں، گرد و نواح کے سرسبز پہاڑوں، کونچا بیچ کی گہما گہمی اور خوشگوار موسم نے قاضی ولی محمد جیسے سکّہ بند بزرگ کو بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ یہاں میں قاضی صاحب کا مختصر تعارف کروا دینا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ کتاب کے آئندہ اوراق میں بھی ان کا ذکر آئے گا۔ عالی جناب میر ریزہ قاضی ولی محمد صاحب سیکرٹری روبکاری خاص اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال

ذوالعزوالجلال و سیکرٹری محکمۂ نشر و اشاعت محتشمہ عالیہ اسٹیٹ کونسل دارالاقبال بھوپال نے آج سے ۵۵ برس پیشتر ہسپانیہ میں قدم رنجہ فرمایا اور ہندوستان واپسی پر سفرنامہ اندلس "ترتیب دیا۔ قاضی صاحب وضع دار قسم کے بزرگ تھے۔ اوّل تو موٹرگاڑی میں سفر کرتے اور اگر کہیں نصیب دشمناں ٹرین میں سوار ہونا پڑتا تو درجہ اوّل میں بھی انھیں کوفت ہوتی۔ شہر کے بہترین ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے اور اُٹھتے بیٹھتے سرکار برطانیہ کی نمک خواری پر نازاں "خدا سرسبز رکھے گورنرانِ انگلشیہ کو" کا ورد کرتے۔

قاضی صاحب نے آج سے نصف صدی قبل ضعیف العمری اور نازک مزاجی کے باوجود اسلامی تاریخی مقامات اور عمارتوں کی تلاش میں ہسپانیہ کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ جہاں اُن کا اندازِ بیان بے حد شگفتہ ہے وہاں ان کی تاریخی بصیرت بھی حیران کن ہے۔ میں جب بھی ان کے سفرنامۂ اندلس کی ورق گردانی کرتا ہوں تو مجھے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ "اندلس میں اجنبی" ایک کھلنڈرے، لاپرواہ اور کم علم سیاح کی آوارہ گردی کی داستان ہے۔ مگر قاضی صاحب کا "سفرنامۂ اندلس" ایک محقق اور صاحب علم ہستی کی سیاحت کا نچوڑ ہے جس میں ہسپانیہ کے شہروں، دریاؤں، جھیلوں، پھولوں، زراعت، موسم، ریل، گداگروں، خانقاہوں اور قمار خانوں سے لے کر چڑیاؤں اور موذی جانوروں تک کا ذکر ملتا ہے۔ وہ سفرنامے کے آغاز میں لکھتے ہیں "میں نے ۱۹۲۲ء کا سفرِ یورپ محض اندلس کی صحرانوردی کے لیے کیا تھا۔ یہ اوراقِ پریشاں سامانِ دلکشی سے مُعرّا ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری، مجالس کی دلفریبی، رقص و سرود کی بزم آرائیاں دیکھنا مقصود ہو تو فرانس اور لندن کے سفرنامے کو دیکھو۔ اندلس میں راقم الحروف نے سب سے جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے جو بجائے تھیٹر، باغات، محلات، بازارات، میلہ مناظر تفریح کے ہمیشہ پرانے کھنڈروں کی طرف جانکلتا ہے۔ ہر شہر کے شکستہ و ریختہ آثارِ اسلامی کا ہلکا سا نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ مقامات کی سیر کے لیے کافی فرصت

اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ ایک ملازم پیشہ۔ غریب الدیار ناواقف سیاح چار ماہ کی قلیل مدت میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں — یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

آئندہ اوراق میں قاضی صاحب بھی میرے ہمراہ ہوں گے۔ اُمید ہے آپ اُن کے طرزِ بیان اور وضع داری سے لطف اندوز ہوں گے۔ سب سے پہلے تو سان سباستیان کے بارے میں ان کے تاثرات سنیے۔ لکھتے ہیں:-

"سنت سبیشین کا شہر ہلالی شکل میں آباد ہے۔ دونوں گوشوں پر ٹیکرے آ گئے ہیں۔ وسط میں ایک ٹیکرہ سمندر میں مثل جزیرہ آ گیا ہے۔ ساحلِ سمندر پر زن و مرد نیکوں ریشمی جانگیہ پہنے دوڑتے جاگتے۔ اُچھلتے کودتے چمک بلبہ کھیلتے پھرتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں تو وہیں زمین پر لیٹ جاتے ہیں۔ سمندر میں تیرتے ہیں اور باہر نکل کر تازہ آبِ شیریں میں غوطہ لگا کر لباس بدلتے ہیں۔ صدہا زن و مرد کا روزانہ صبح و شام یہی مشغلہ ہے۔ فرصت ہوئی تو ٹینس کے لیے نکل گئے یا رقص خانہ میں جا کر مونگ خرامی ہو گئے۔ غرضیکہ ہر شخص بے فکر و بدمست ہے۔"

آج پچیس برس بعد بھی سان سباستیان کے ساحل کا نقشہ انہی الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے۔ دونوں گوشوں پر ٹیکرے یعنی اگلیڈو اور اُرگل کی پہاڑیاں۔ درمیان میں ایک ٹیکرہ سمندر میں مثل جزیرہ یعنی سانتا کلارا۔ اس وقت بھی میرے سامنے زن و مرد ریشمی جانگیے پہنے دوڑ بھاگ رہے تھے۔ شاید یہ چمک بلبہ بھی کھیل رہے ہوں۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہ چمک بلبہ کیا بلا ہوتی ہے۔

پونے چار بجے کے قریب لوگوں نے ساحل سے اُٹھنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یا تو ان سب کو یکدم کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہے اور یا پھر سامنے والے سانتا کلارا جزیرے میں ایٹمی دھماکے کا تجربہ ہوا چاہتا ہے۔ چار بجے تک پوری کی پوری بیچ پر صرف

دو ٹیچر۔ ایک مستنصر اور ایک بوڑھا رہ گئے۔ میں نے بوڑھے سے جو میرے قریب ہی اوندھے منہ لیٹا اونگھ رہا تھا اس ہجرت کا سبب پوچھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی اور پھر جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"کوریدا۔ کوریدا" اس نے دونوں ہاتھ بے قراری سے ہوا میں لہرائے اور جلدی سے اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے چل دیا۔

مجھے یاد آیا کہ پیرس کے قہوہ خانہ پگال میں ایک امریکی نے مجھے یہ بتا کر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا کہ وہ ہر اتوار باقاعدگی سے سان سباستیان صرف اس لیے جاتا ہے کہ وہاں کے بل رنگ میں ہسپانیہ کے بہترین بل فائٹر اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ آج اتوار تھا اور چار بج رہے تھے۔ "کوریدا" یعنی بل فائٹ شروع ہونے کو تھی۔ میں نے جلدی سے سمندر کے نمکین پانی میں ایک ڈبکی لگائی۔ پھر باہر نکل کر تازہ آبِ شیریں میں غوطہ لگا کر کپڑے بدلے اور ساحلی سڑک کو پار کر کے شہر کی جانب چل دیا۔ بل رنگ کا راستہ دریافت کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ سان سباستیان کے باشندوں کی اکثریت ایک ہی جانب رواں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں شیرینی بٹ رہی ہے اور لوگ اپنا حصہ لینے جا رہے ہیں۔ اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں آج کی بل فائٹ کے بارے میں تفصیلی کتابچے تھے۔ آج کی فائٹ میں لڑنے والے تین بل فائٹروں کے زندگی کے حالات۔ مقابلے میں آنے والے بل کس کس فارم پر پلے ہیں؟ کونسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟ وغیرہ۔

سان سباستیان کا بل رنگ شہر سے باہر سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ بل رنگ کے سامنے اتنا زبردست ہجوم تھا کہ بل رنگ کی پہلی منزل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹکٹ گھر کے بارے میں جس کسی ہسپانوی سے پوچھتا وہ اپنی زبان میں کوئی لچھے دار فقرہ کہہ کر غائب ہو جاتا۔ بل فائٹ شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے اور ہر شخص اسی کوشش میں تھا کہ جلد از جلد ٹکٹ خرید کر بل رنگ

کے اندر بہترین نشستوں پر قبضہ جمائے۔ خاصی دیر اِدھر اُدھر دھکے کھانے کے بعد ایک بڑی اماں کو میرے حال پر ترس آگیا اور اس نے مجھے ٹکٹ گھر تک پہنچا دیا۔ اسّی پیسیے والے ٹکٹ کے حصول کے لیے باقاعدہ دھکم پیل جاری تھی۔ چونکہ لاہور کے سینماؤں میں ٹکٹ خریدتے وقت ایسے دشوار مراحل سے کئی مرتبہ سرخرو ہو کر نکلا تھا اس لیے میں نے سو پیسیے کا ایک نوٹ مٹھی میں دابا اور خالص لاہوری انداز میں "ایلی" کا نعرہ لگا کر صفیں چیرتا ہوا کھڑکی تک جا پہنچا۔ میری مٹھی جب ٹکٹ فروخت کرنے والے کی ناک کے عین سامنے کھلی تو اس ظالم نے انگلیاں نچا کر ٹکٹ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ایک سو بیس پیسیے والا ٹکٹ خریدا جائے۔ بُل رنگ کے گرد بنی ہوئی راہداری سے بالائی منزل تک لکڑی کی سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ پہلی منزل پر ٹکٹ دکھایا تو گیٹ کیپر نے منہ بنا لیا اور انگلی کھڑی کر کے اُوپر کی طرف اشارہ کر دیا۔ دوسری منزل پر بھی یہی حشر ہوا۔ بالآخر تیسری منزل پر قسمت نے یاوری کی اور میں تماشائیوں کے ایک ریلے کے ساتھ بُل رنگ کے اندر پہنچ گیا۔

ہے تورو

سان سباستیان کے یونانی تھیٹر نما بُل رنگ میں ہزاروں تماشائی دم سادھے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ان سب کی نظریں ایک نقطے پر منجمد تھیں۔ ایک ایسا نقطہ جس کی زد میں ایک سُرخ پھاٹک اور اس کے کواڑ پر ہاتھ رکھے ایک بوڑھا آیا ہوا تھا۔ میری نظریں بھی اسی ایک نقطے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ بُل رنگ کا نصف حصہ سائے میں تھا اور بقیہ نصف حصے پر تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ بُل رنگ کی بالائی منزل کہ جہاں میں بیٹھا تھا اسلامی طرزِ تعمیر کی خوبصورت محرابیں گھیرے ہوئے تھیں۔ سُورج کی کرنوں سے منور نصف حصے میں واقع محرابوں کا سُرخ رنگ نہایت شوخ لگ رہا تھا۔ سُرخ رنگ جو بُل فائٹ کا نمایاں رنگ ہے........ سُرخ محرابیں۔ سُرخ رُومال۔ سُرخ وردیاں اور پھر سُرخ خون........ اکثر اوقات بُل کا اور کبھی کبھار انسان کا........ بُل فائٹر کا۔ بُل رنگ کے درمیانی میدان کی سطح پر بچھی ریت نہایت ہموار تھی۔ میدان بالکل خالی پڑا تھا... چند لمحوں میں یہاں موت کے سائے رو شنیوں کا پیچھا کرنے والے تھے۔ میں اپنے ارد گرد بیٹھے ہزاروں لوگوں کی طرح ایک ایسے ڈرامے سے پردہ اُٹھنے کا منتظر تھا جس میں دوپہر کی دھوپ، شام کے سائے، گرم ریت، ایک حیوان اور ایک انسان مرکزی کردار ادا کرنے والے تھے۔ انسان یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس میں موت کے سامنے

سینہ سپر ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ اب بھی لاکھوں برس قبل جنگلوں میں رہنے والے اپنے آباؤ اجداد کی مانند ایک جنگلی درندے کے سامنے اکیلا خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکتا ہے اور اسے اپنی قوتِ بازو سے زیر کر سکتا ہے۔ اور حیران...... یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انسان یہ جنگ جیت بھی لے تو کیا۔ یقینی موت کا سامنا بے جگری سے کرنا ہی جرأت کی معراج ہے۔

ہر سُو مکمل سکوت تھا۔ میں لکڑی کی سخت نشست پر بیٹھا نیچے سُرخ دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اچانک بگل کی تیز آواز بُل رنگ میں گونج گئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اُتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سُرخ پھاٹک زور لگا کر دھکیلا اور پھر بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چند ثانیوں میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بُل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اصطبل میں سے سرپٹ دوڑتا ہوا اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔ اس مکمل سکوت میں اس کے طاقتور سُموں کی دھمک تیسری منزل پر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے بوجھ تلے بُل رنگ کی زمین لرز رہی تھی۔ اس نے میدان کا ایک چکر لگایا۔ شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ میدان خالی نظر آیا تو لکڑی کی اونچی گیلری پر حملہ آور ہوا۔ گیلری کے پیچھے بیٹھے ہوئے چند تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دو چار ٹکروں کے بعد جب بُل کو احساس ہوا کہ وہ گیلری توڑ کر تماشائیوں تک نہیں پہنچ سکتا تو بھاگتا ہوا میدان کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ طاقتور، مغرور اور ہسپانوی زبان میں "بیرافناو"۔ یعنی ناقابلِ تسخیر۔ اس کو اپنے آپ پر اعتماد ہے کہ وہ اپنے راستے میں حائل ہونے والی ہر شے کو فنا کر دے گا۔ کیونکہ اس میں ایک اچھے بُل کی تمام خاصیتیں موجود ہیں۔ مضبوط مربّی کھال، چمکتی آنکھیں، چوڑا ماتھا، سُم اور سر چھوٹے۔ موٹی گردن جس پر گوشت کی تہیں جمی ہوئی تھیں، چوڑے کاندھے۔ دُم لمبی اور پتلی اور پھر اس کا خطرناک ترین ہتھیار سینگ جو آگے کی طرف مُڑے ہوئے تھے۔ ایک اعلیٰ نسل کا بُل جو بہترین بُل فائٹنگ کے لیے موزوں ترین تھا۔

بُل کے میدان کے درمیان میں کھڑے ہوتے ہی یہ مکمل سکوت کچھ یوں ٹوٹا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی: "بے تورو، بے تورو۔" تماشائی اپنے رومال، ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے دو موٹے ہسپانوی میدان میں کھڑے بُل کے بارے میں بحث کرنے لگے۔

"بُل شکل سے تو "براریتو" یعنی بہادر لگتا ہے۔"

"نہیں مجھے تو "آران کادا" یعنی قدرے بزدل معلوم ہوتا ہے۔"

اگلی نشست پر بیٹھی ایک بڑھیا نے مُڑ کر دونوں کو ڈانٹ پلائی۔ "براریتو یا آران کادا نہیں ہے صرف مانسو یعنی غصیلا ہے۔"

"سال بڑی اماں تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ براریتو نہیں ہے کیونکہ بُل کی بہادری اس کی ماں پر منحصر ہوتی ہے۔" اُدھر سے جواب آیا۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ بڑھیا نے بھی بُل کی ماں کا خطاب ملنے پر بالکل بُرا نہ مانا۔

بُل جو پہلے سر اٹھائے ہوئے بڑے اعتماد سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا پبلک کے شور مچانے پر قدرے گھبرا گیا۔ ہزاروں آوازوں کا شور "بے تورو، بے تورو" اس نے بُل رنگ کے چاروں طرف دیکھا۔ اپنے پچھلے سُم ریت میں رگڑتے اور پٹختے ہوئے میدان کے درمیان سر اُٹھا کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ "بیرافناو" یعنی ناقابلِ تسخیر۔

بُل فائٹنگ ہسپانوی تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر ہسپانیہ کا وسیع کینوس بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ غیر ملکی اسے بربریت سے بھرپور وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دیتے ہیں۔ بھلا جس کھیل میں ہر بار چھ بھینسے ہلاک ہوں، متعدد گھوڑے زخمی ہو جائیں اور کبھی کبھار انسان بھی مارا جائے اُسے کھیل کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اُدھر ہسپانوی بُل فائٹنگ کو موسیقی، رقص اور مصوّری کی مانند فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ بربریت کے الزام کے جواب میں وہ امریکی فٹ بال اور

باکسنگ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ان ہر دو کھیلوں میں مرنے والوں کی تعداد بُل فائٹنگ میں ہلاک ہونے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر بُل فائٹنگ ظالمانہ کھیل کیسے ہو گیا اور اگر ہو بھی تو ہسپانویوں کے نزدیک اتنی ڈھیر ساری خوبصورتی کے لیے تھوڑا سا ظلم بھی جائز ہے اور جہاں تک ناقدین کا تعلق ہے وہ جائیں بھاڑ میں۔

ہر ہسپانوی بُل فائٹنگ کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے پرکھتا ہے۔ چند ایک کے لیے یہ جذباتی مسئلہ ہے۔ ان کی تمام ہمدردیاں بُل فائٹر کے ساتھ ہوتی ہیں اور داد و تحسین کے نعرے بُل کے لیے۔ کچھ لوگ اُسے اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بناتے ہیں: کیا بُل فائٹنگ کا انداز "ویرونیکا" سینٹ ویرونیکا کے نام پر نہیں جس نے رومال سے حضرت عیسیٰ کے چہرے سے پسینہ پونچھا تھا؟ چند ایک کے لیے یہ انا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ میدان میں کھڑا بُل فائٹر ایک ہسپانوی ہے اور اس کے سامنے سرنگوں بُل دنیا کی تمام دوسری قومیں۔ کچھ لوگ بہرصورت بُل فائٹر کو ہلاک ہوتا ہوا دیکھنے کی تمنا لے کر آتے ہیں۔ بہرحال وجوہات کچھ بھی ہوں بُل فائٹنگ ایک ایسا کھیل یا فن ہے جس کے بغیر شاید ہسپانوی روح مُردہ ہو جائے۔ جس طرح خوبصورت موسیقی سے لُطف اندوز ہونے کے لیے ذوق کے ساتھ ساتھ موسیقی کی رمزیں جاننا ازحد ضروری ہے اسی طرح بُل فائٹنگ کو سمجھنے اور پسند کرنے کے لیے اس فن کے بارے میں چند بنیادی باتیں جاننا بھی انتہائی اہم ہے ورنہ پہلی بار اس کھیل کو دیکھنے والے تماشائی کو شاید بُل فائٹر صرف ایک ظالم قصاب کی صورت میں نظر آئے جو غریب بُل کو ہلاک کر کے عوام سے داد وصول کرتا ہے۔

بُل فائٹنگ کے پیشے کی دلکشی، شہرت، عزت اور دولت ایسے عناصر ہیں جو ہزاروں ہسپانوی نوجوانوں کو ہر سال اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں اکھاڑوں میں استاد پہلوان نوجوان لڑکوں کو داؤ پیچ سکھاتے ہیں اور ان میں سے معدودے چند ہی اس پیشے کی بلندیوں پر پہنچ پاتے ہیں۔ ایسے ہی ہسپانیہ کے اکثر

شہروں میں بُل فائٹنگ کے باقاعدہ سکول ہیں وہاں سے کامیاب ہونے والے ایک ہزار نوجوانوں میں سے بمشکل ایک سو کسی چھوٹے موٹے بُل رنگ میں داخل ہوتے ہیں اور ان میں سے دو چار ہی پیشہ ور بُل فائٹر بننے میں کامیاب ہوتے ہیں اور پھر ہزاروں پیشہ ور بُل فائٹروں میں سے ایک دو شہرت کی اُن بلندیوں کو پہنچتے ہیں جن کی کشش انہیں اس پیشے میں کھینچ لائی تھی۔ پیشہ ور بُل فائٹر کا خطاب ہمیشہ میڈرڈ کے بُل رنگ میں دیا جاتا ہے۔

بُل فائٹنگ میں دو طرزیں ہیں۔ ایک اندلس کی اور دوسری میڈرڈ سے متعلق ہے۔ میڈرڈ کی روایات کے پابند بُل فائٹر کا رجحان شوخی کی جانب ہوتا ہے اور وہ بُل کے گزرنے کے بعد ایک بُت کی مانند ساکت ہو جاتا ہے۔ بُل فائٹر اندلس کا ہو تو وہ صاحب طرز اور پھرتیلا ہو گا۔

ارنسٹ ہیمنگوے اپنی کتاب (   ) میں لکھتا ہے: "اندلس کے صوبے کو ہمیشہ سے یہ فخر حاصل ہے کہ عظیم بُل فائٹروں کی اکثریت اسی خطۂ زمین سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کے بُل بھی ہسپانیہ بھر میں بہترین مانے جاتے ہیں۔ یہ گرم آب و ہوا اور مسلمانوں کے خون کی آمیزش کا اثر ہے کہ اندلسی بُل فائٹر پُر وقار اور پُرسکون ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیات ہسپانیہ کے دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے بُل فائٹروں میں ناپید ہیں۔"

عام تخیل کے برعکس ایک اچھے بُل فائٹر کے لیے طاقتور ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اچھا بُل فائٹر تکنیک اور سائنس کی آمیزش کو بروئے کار لا کر بُل کو اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ ایک دفعہ خانہ بدوش بُل فائٹر رافیل ال گالو سے کسی نے پوچھا کہ وہ اپنی طاقت بڑھانے کی خاطر کونسی ورزش کرتا ہے تو اس نے جواب دیا: "مجھے طاقت کی کیا ضرورت ہے۔؟ عام بُل کا وزن تقریباً آدھ ٹن ہوتا ہے۔ کیا میں ورزش کے ذریعے اس کی طاقت کی ہمسری کر سکتا ہوں؟ بُل کو اپنی طاقت بڑھانے دو۔"

ایک بُل فائٹ میں چھ بُل ہلاک کیے جاتے ہیں اور ہر بُل فائٹر کے حصے میں دو بُل

آتے ہیں۔ اگرچہ آٹھ ماہ کے بل فائٹنگ کے سیزن میں (سردیوں میں بل فائٹنگ نہیں ہوتی)
ایک بل فائٹر سو سے زیادہ بل ہلاک کرتا ہے مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ بل فائٹر ہمیشہ ہی اس
کھیل کے اختتام پر فاتح بن کر ابھرے۔ کبھی کبھار کسی گرم دوپہر بل کے نوکیلے سینگ چشم زدن
میں سنہری ریشمی لباس پھاڑ کر سرخ خون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ سرخ انسانی خون میں......
ہسپانیہ کا عظیم بل فائٹر مونالیتے ایک ایسی ہی دوپہر کو جب لنارس کے غیر معروف
بل رنگ میں ہلاک ہوا تو پورے ہسپانیہ میں سرکاری طور پر سوگ منایا گیا۔ اسی لیے تو بل فائٹ
کو پُر وقار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک اور افسوسناک بھی قرار دیا جاتا ہے۔

عظیم بل فائٹروں کی اکثریت بل کی بجائے ٹی بی اور سفلس جیسے امراض کا شکار
ہوتی ہے۔ بل فائٹر جب بل رنگ میں قدم رکھتا ہے تو سورج اپنی پوری آب و تاب
سے چمک رہا ہوتا ہے۔ بھاری اور تنگ لباس کے اندر ہوا کا گزر تک نہیں ہوتا
اور اس کے جسم سے پسینے کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ سورج
غروب ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بل فائٹ کے اختتام پر خاصی خنکی ہو جاتی ہے۔
گرمی اور سردی کی شدت اس کے پھیپھڑوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بل رنگ کی ہوا
بھی مہلک ثابت ہوتی ہے اور بل فائٹر ٹی بی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا
ہے کہ موسمی عناصر کے تغیر پر تو اس کا اختیار نہیں مگر سفلس......؟ اس کا جواز کچھ
یوں دیا جاتا ہے کہ بل فائٹر بھی ایک فنکار کی مانند اگر شادی کر لے تو اس کی
صلاحیتیں منقسم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چونکہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ عورتوں
سے میل جول بڑھانے سے قبل انہیں اچھی طرح پرکھ سکے۔ اس لیے کبھی نہ کبھی کوئی
"چنچل لڑکی" اسے یہ خوفناک تحفہ دے جاتی ہے۔ بل فائٹر اپنی جان نہ صرف بل رنگ
میں بلکہ بستر میں بھی داؤ پر لگاتا ہے۔

چونکہ بل فائٹ صرف اس وقت شروع کی جاتی ہے جب بل رنگ کا نصف
حصہ دھوپ میں اور بقیہ نصف چھاؤں میں آ جائے۔ اس لیے بل فائٹ کے اوقات

بدلتے رہتے ہیں۔ اس عظیم تماشے کی تکنیک اور کامیابی کا راز سورج کے چھپنے میں پنہاں ہے۔
جب تک سورج بل رنگ کے نصف حصے پر نہ چھپے بل فائٹنگ کا لطف نہیں آتا۔ ایک
ہسپانوی مقولے کے مطابق "سورج سب سے عظیم بل فائٹر ہے" دھوپ کے بغیر بل فائٹر
اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہے یوں جیسے وہ سائے کے بغیر پیدا ہو گیا ہو۔

بل فائٹر اور سورج کے بعد بل فائٹنگ کی سٹیج کا سب سے اہم کردار بل ہوتا ہے۔
ہسپانیہ کے طول و عرض میں متعدد ایسے فارم ہیں جہاں پر بل فائٹنگ میں حصہ لینے والے
اعلیٰ نسل کے بل پالے جاتے ہیں۔ ہر فارم کا بل خصوصی عادات و اطوار کا مالک ہوتا
ہے۔ تجربہ کار تماشائی بل کے بل رنگ میں داخل ہوتے ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں
فارم کا پروردہ بل ہے۔ پرورش کے دوران میں سوائے رکھوالے کے اور کوئی شخص بل
کے پاس نہیں پھٹک سکتا تاکہ وہ انسان کے ساتھ میل جول سے اپنے خوفناک
جنگلی اطوار نہ کھو دے۔ یہی وجہ ہے کہ بل رنگ میں داخل ہوتے ہی تماشائیوں کا
شور و غوغا بل کو پریشان کر دیتا ہے۔ دریائے وادی الکبیر کی دلدلوں میں پرورش
پانے والے بل بہترین جانے جاتے ہیں۔ ۱۸۵۰ء میں کونچا فارم کے پروردہ
بل نے اپنے سینگ سے ڈومینگو نامی بل فائٹر کی ایک آنکھ نکال دی۔ اس حادثے کے
بعد ڈومینگو کو کانا بل فائٹر کہا جانے لگا اور اس نے قسم کھائی کہ اب وہ ساری زندگی
صرف کونچا فارم میں پلے ہوئے بل سے ہی لڑے گا۔

بہترین بل فائٹنگ کے لیے بل کا وحشی اور ناتجربہ کار ہونا از حد ضروری ہے۔
اسی لیے جو بل ایک مرتبہ بل رنگ میں داخل ہو جائے اسے ہمیشہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔
اگر کسی وجہ سے اسے بل رنگ میں نہ مارا جا سکے تو پھر بل فائٹ ختم ہونے پر اسے
فارم میں لے جا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر بل نہ مارا جائے اور ایک سے زائد مرتبہ
اسے بل رنگ میں داخل ہونے کا موقع دیا جائے تو پچھلے تجربے کی بنا پر بل فائٹر
کو یقیناً ہلاک کر دیتا ہے۔ شروع شروع میں جب یہ پابندی عائد نہ تھی تو ہر سال بل

رنگ میں سینکڑوں بُل فائٹر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے چنانچہ ۱۵۶۷ء میں پوپ نے اُن تمام عیسائی شہزادوں کو مذہب سے باہر نکال دینے کی دھمکی دے دی جن کی ریاستوں میں بُل فائٹنگ رائج تھی۔ بالآخر سب نے متفقہ طور پر ایک ایسا قانون لاگو کرنے کا فیصلہ کیا جس کے تحت ایک بُل صرف ایک مرتبہ ہی بُل فائٹنگ میں حصّہ لے سکتا تھا۔

اب بھی ہسپانیہ کے دُور افتادہ قصبوں میں اس قانون کا احترام نہیں کیا جاتا۔ قصبے کے باشندے اتنے غریب ہوتے ہیں کہ وہ ہر بُل فائٹ کے لیے نیا بُل خریدنے کی سکت نہیں رکھتے، چنانچہ ذہانت اور تجربہ کا بُل ہمیشہ بُل فائٹر کو ہلاک کر دیتا ہے۔ ایک ایسے ہی بُل کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک سیزن میں سولہ بُل فائٹر ہلاک کر ڈالا۔ اس کا سولھواں شکار ایک چودہ سالہ خانہ بدوش لڑکا تھا جس کا ایک بھائی اور بہن اس حادثے کے وقت بُل رنگ میں موجود تھے۔ ان دونوں نے اس قاتل بُل سے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد بُل جہاں بھی جاتا وہ اس کا پیچھا کرتے تاکہ موقع پا کر اس کا کام تمام کر دیں۔ اُدھر بُل کا مالک اپنے قیمتی جانور کی بے حد حفاظت کرتا تھا اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یونہی کئی برس بیت گئے اور خانہ بدوش لڑکا اور لڑکی انتقام کی آگ سینے میں سلگائے بُل کا تعاقب کرتے رہے۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ بُل بوڑھا ہو گیا اور اس کے مالک نے اسے ناکارہ جان کر ولنسیا کے بوچڑ خانے میں فروخت کر دیا۔ خانہ بدوش جوڑے نے بوچڑ خانے کے مالک کو اپنے پیارے بھائی کے ہلاک ہونے کی داستان سنائی اور اس سے درخواست کی کہ انہیں بُل کو مارنے کی اجازت دی جائے۔ مالک کو تو صرف بُل کے گوشت سے غرض تھی چنانچہ اس نے اجازت دے دی۔ اور یوں لڑکے نے پہلے اپنی انگلیوں سے بُل کی دونوں آنکھیں نوچ ڈالیں اور پھر خون آلود گڑھوں میں تھوکا۔ اس کے بعد اس نے ریڑھ کی ہڈی خنجر سے کاٹ دی۔

سب سے آخر میں دونوں بہن بھائیوں نے بُل کا کلیجہ نکالا اور بوچڑ خانے سے باہر گرد آلود گلی میں بیٹھ کر اُسے ایک سیخ پر بھون کر کھا گئے۔ اس انوکھے انتقام کے بعد وہ چپ چاپ اپنے وطن کو لوٹ گئے۔

گیٹ کیپر کو جب اپنا ٹکٹ دکھا کر بُل رنگ کے اندر داخل ہُوا تھا تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے شوخ رنگوں کا ایک متحرک سیلاب ہے جو میری آنکھوں میں کھنچا چلا آتا ہے۔ پورا بُل رنگ ایک بڑے مٹی کے پیالے کی مانند تھا جس کے اندرونی حصّے میں ہر رنگ کے چھینٹے تھے۔ بُل رنگ کے آداب سے ناواقفیت کی بنا پر لکڑی کی سخت نشست پر رکھنے کے لیے گدا لانا بھول گیا تھا۔ یہ گدے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ تماشائیوں کی اکثریت ہسپانوی تھی مگر مختلف گروہوں میں غیر ملکی سیاح بھی تھے۔ کیمرے اور بُل فائٹ کے کتابچے ہاتھوں میں لیے وہ اپنے گائیڈ حضرات کا مُنہ تک رہے تھے جو انہیں ہونے والی بُل فائٹ کی تفصیلات بتا رہے تھے۔

بُل کے میدان کے اندر داخل ہونے پر بُل فائٹ شروع نہیں ہوتی بلکہ اس کا آغاز اس سے بہت پہلے ایک رسمی کارروائی کے ذریعے ہوتا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

بُل فائٹ شاید ہسپانیہ کی وہ واحد تقریب ہے جس کا آغاز وقتِ مقررہ پر ہوتا ہے۔ عین وقت پر پورا ہجوم بالکل خاموش ہو گیا اور سب کی نگاہیں سایہ دار حصے میں واقع صدر کی کیبن پر لگ گئیں۔ صدر نے جو اس تقریب کا مختارِ کُل ہوتا ہے اپنا معطر رُومال فضا میں لہرا کر بُل فائٹ کے شروع ہونے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی بُل رنگ میں بگل کی آواز گونجی اور شاہانہ لباس میں ملبوس دو گھڑ سوار اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے صدر کی کیبن کے عین نیچے آن رُکے۔ یہ گھڑ سوار "ال گوسلز" کہلاتے ہیں۔ صدر کے تمام احکامات بُل فائٹر تک پہنچانا ان کے ذمے ہوتا ہے۔ گھڑ سوار جھک کر صدر سے پریڈ کے آغاز کی اجازت ملنے پر اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے

بل رنگ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ صدر کی کیبن سے ملحقہ کیبن میں موسیقاروں کا ایک طائفہ
بل فائٹ کی روایتی دھنیں بجانے لگا۔ ان میں بگل کی آواز نمایاں ہے۔ موسیقی شروع
ہوتے ہی لوگوں کی نگاہیں صدر کی کیبن سے ہٹ کر مخالف سمت میں واقع دروازے
پر لگ گئیں۔ اب "پاسیو" یا پریڈ شروع ہونے کو تھی۔ اس پریڈ میں بل فائٹ میں شامل
تمام افراد اور جانور حصہ لیتے ہیں۔ پاسیو کی قیادت گھڑ سوار "ال گوسلز" کرتے ہیں۔ اُن
کے پیچھے تینوں بل فائٹر شانہ بشانہ ٹھوڑیاں اُوپر کیے۔ آنکھیں صدر کی کیبن پر جمائے
ہجوم کی تالیوں کے جواب میں ہاتھ ہلاتے ہوئے چلتے آ رہے ہیں۔ ان کے سنہری ہیٹ
بروکیڈ کی سنہری وردیاں اور ریشمی پتلونوں پر جڑے ہوئے رنگ برنگے شیشوں پر
نظر نہیں ٹکتی۔ بل فائٹروں کے ہمراہ مددگار بل فائٹر بھی چلے آ رہے ہیں جو آڑے وقت
میں بل کو اپنی طرف متوجہ کر کے بل فائٹر کی جان بچا لیتے ہیں۔ ان کے عقب میں چپڑاسی
ہوتے ہیں۔ چپڑاسیوں کے پیچھے "باندریلو" آ رہے ہیں اور پھر گھڑ سوار "پکاڈور" یا
برچھی بردار۔ سب سے آخر میں بل رنگ میں کام کرنے والے ملازم اُن خچروں کو لیے
آتے ہیں جو مُردہ بل کو گھسیٹ کر اصطبل میں لے جانے کے کام آتے ہیں۔ تابوتوں، ہتھیاروں
اور میت اٹھانے والوں کا جلوس۔

صدر کی کیبن کے نیچے پہنچ کر بل فائٹر اپنے ہیٹ اتار صدر کو کورنش بجا لاتے ہیں
اور پھر جلوس منتشر ہو جاتا ہے۔ بل فائٹر بل رنگ کی گیلری کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ باقی
عملہ بل رنگ سے باہر چلا جاتا ہے۔ "پاسیو" کا اختتام۔ لکڑی کی گیلری کے پیچھے کھڑے
ہو کر بل فائٹر اپنے نمائشی لبادے اتار کر کسی دوست یا اکثر اوقات اپنی محبوبہ کے حوالے
کر دیتے ہیں۔ بل فائٹ کے دوران میں یہ لبادہ اس شخص کی گود میں یا اس کے سامنے
گیلری پر رکھا رہتا ہے۔ جہاں بل رنگ میں بیٹھے ہوئے تمام تماشائی اُسے آسانی سے دیکھ
سکتے ہیں۔ بل فائٹر اگر خوبصورتی سے لڑے تو داد و تحسین کے ڈونگرے دوست یا محبوبہ پر
بھی برستے ہیں اور اگر خدانخواستہ بل فائٹر پھسڈی ثابت ہو تو سیٹیاں بجتی ہیں اور انہیں

"اولے اولے" کے نعروں سے نوازا جاتا ہے۔

اس اثنا میں بل رنگ کے ملازم میدان میں بچھی اُس ریت کو ہموار کرتے ہیں جو پاسیو
کے گزرنے سے بکھر جاتی ہے۔ کس بل فائٹر کو کون سے بل سے مقابلہ کرنا ہے، اس کا
فیصلہ بل فائٹ شروع ہونے سے قبل لاٹری کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اگر بل فائٹر بہت
بلند پائے کا ہو تو مقابلے کے بل کا انتخاب اس کی ذاتی پسند پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اب
بل رنگ میں داخل ہونے والے پہلے بل کے ساتھ لڑنے والا بل فائٹر اس کپڑے کا انتخاب
کرتا ہے جسے لہرا کر بل سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ کپڑا "کیپ" کہلاتا ہے۔ کیپ باہر سے گلابی
اور اندر سے پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ بل فائٹر اپنی کیپ جسم کے ساتھ لپیٹ لیتا ہے
اور گیلری کے ساتھ لگ کر بیتابی اور بے چینی کی حالت میں بل کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ یہ
وقت ایسا ہوتا ہے جب ہر بل فائٹر بے حد مذہبی ہو جاتا ہے۔ وہ فر فر دُعائیں مانگتا ہے
اور بار بار اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے۔ "کنواری مریم آج لاج رکھ لیجیو......
کنواری مریم بل شریف قسم کا ہو۔ سینگ زیادہ نوکیلے نہ ہوں بلکہ کیلے کی مانند ہوں۔ کنواری
مریم اگر مجھے بل کی دُم عطا ہو جائے تو گرجے میں جا کر پوری سو موم بتیاں جلاؤں گا۔"

اُدھر گھڑ سوار "ال گوسلز" دوبارہ صدر کی کیبن کے نیچے جاتے ہیں اور اصطبل کی
چابی طلب کرتے ہیں۔ صدر اُوپر سے چابی پھینکتا ہے جو وہ اپنے پروں والے ہیٹ
میں دبوچ لیتے ہیں (اگر چابی کو ہیٹ میں نہ اُچکا جا سکے تو ہجوم سیٹیاں بجا کر انہیں
ہُوٹ کرتا ہے) گھڑ سوار واپس آتے ہیں اور چابی سرخ دروازے کے پاس کھڑے بوڑھے
کی طرف پھینک کر میدان سے باہر نکل جاتے ہیں۔

تپتی دوپہر میں موت

اچانک بگل کی تیز آواز رِنگ میں گونج گئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اُتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سُرخ دروازہ زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بل...... رِنگ میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دے رہی تھی "ہے تورو ہے تورو" تماشائی اپنے رُومال، ہیٹ اور ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے ...... بُل فائٹ کے پہلے ڈرامے کا کردار تم ٹھونکے میدان میں کھڑا تھا اور بُل فائٹ شروع ہو چکی تھی۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے موٹے ہسپانوی میدان میں کھڑے بل کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اگلی نشستوں میں براجمان سیاح لڑکیوں کا ایک گروہ زور زور سے تالیاں پیٹ رہا تھا۔

باقاعدہ بل فائٹ کا آغاز بُل فائٹر کی بجائے اس کے معاونین نے کیا۔ اُنھوں نے بُل کے آگے کیپ لہرا کر اُسے چھیڑا اور پھر بُل کے مشتعل ہونے پر اُس کے آگے پیچھے بھاگنے لگے۔ اُن کا مقصد بُل کو اِدھر اُدھر بھگا کر اُس کی تیزی ختم کرنا تھا۔ اس دوران میں بُل فائٹر لکڑی کی گیلری کی آڑ لیے بُل کی عادات و اطوار کو جانچ رہا تھا، کونسا سینگ زیادہ استعمال کرتا ہے! کونسی آنکھ تیز ہے! کس جانب سے حملہ آور

ہوتا ہے! گردن کس زاویے پر جُھکاتا ہے! تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے بعد معاونین واپس چلے گئے۔ اب بُل فائٹر گیلری سے نکل کر میدان میں داخل ہُوا، اور پورا رِنگ تماشائیوں کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ بُل فائٹر نے اپنی کیپ دونوں ہاتھوں میں کچھ یوں تھام رکھی تھی جیسے اُسے دھوپ میں سُکھا رہا ہو۔ وہ بُل سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر جا کھڑا ہُوا اور کیپ جھٹک کر اُسے حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ بُل اپنی تھوتھنی اُٹھائے خاموش کھڑا رہا۔ بُل فائٹر نے تھوڑے قریب ہو کر پھر کیپ جھٹکی مگر بُل ٹس سے مس نہ ہُوا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ یہ بُل بزدل ہے۔" میرے قریب بیٹھے موٹے ہسپانوی نے اپنے ساتھی کو چھیڑا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ بُل یقیناً بہادر ہے اور ابھی حالات کا جائزہ لے رہا ہے۔" اُس کے ساتھی نے سنجیدگی سے کہا۔

بل فائٹر اب کیپ جھٹکنے کے ساتھ ساتھ بُل سے باتیں بھی کرنے لگا...... ہو ہو...... ہو ہو ہے...... ہے تورو! بُل نے بالآخر سر اُٹھا کر بُل فائٹر کو بڑی ناراضگی سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ کیسے ہے تورو اور ہے ہے کی لایعنی گردان کر رہے ہو، جاؤ اپنا راستہ ناپو۔ کیوں ہم فقیروں کو ڈسٹرب کرتے ہو؟ اُدھر بُل فائٹر نے اس فقیر کو ڈسٹرب کرنے کی قسم کھا رکھی تھی اور اِدھر تماشائیوں نے تحریکِ عدمِ تعاون کا بے حد بُرا منایا اور "تورو! تورو!" کا شور مچانے لگے۔ موٹے ہسپانوی نے جو بُل کو بزدل قرار دے چکا تھا، منہ میں انگلیاں گھسیڑ کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ میرے کانوں کے پردے لرز اٹھے۔ بُل پر بھی اس شور و غوغا کا خاصا اثر ہُوا۔ اس نے سامنے کھڑے اپنے دشمن کو بڑے غور سے دیکھا۔ پچھلے سُموں سے ریت اُڑائی اور تھوتھنی نیچے کر کے بُل فائٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ بُل کی تھوتھنی اور سینگ کیپ کو چھوتے ہی بُل فائٹر نے پنجوں پر گھوم کر کیپ ہوا میں لہرا دی اور بُل سر پٹخنا کٹے اپنے زور میں

بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔

بُل فائٹنگ کا یہ انداز ویرونیکا کہلاتا ہے۔ بُل کا پہلا وار خالی گیا تو وہ مڑ کر پھر حملہ آور ہوا۔ اب بھی اس کے تیز سینگ بُل فائٹر کے جسم کی بجائے صرف کیپ کو چھو سکا اور وہ ناکام ہو گیا۔

"کیوں بھئی" موٹے ہسپانوی نے اپنے ساتھی کو ٹھوکا دیا "بُل بہادر ہے کہ نہیں؟"

اب بُل بار بار بُل فائٹر کی طرف لپکتا مگر وہ ویرونیکا انداز سے اپنے آپ کو صاف بچا جاتا۔ جب بُل سر نیچا کر کے بُل فائٹر کی جانب دوڑنا شروع کرتا تو تماشائی ایک ساتھ او...... او...... او کا نعرہ لگاتے اور جونہی بُل کے سینگ کیپ کو چھوتے اور بُل فائٹر پنجوں پر گھوم کر اپنے آپ کو بچا جاتا۔ اس نعرے کا اختتام "لے" پر ہوتا "اولے" ہسپانویوں کا مرحبا کہنے کا خاص انداز ہے جس کے بارے میں شفیق الرحمٰن کو شبہ ہے کہ یہ واللہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ تماشائیوں سے بے پناہ داد ملنے پر بُل فائٹر قدرے نڈر ہو گیا اور آگے بڑھ بڑھ کر بُل کو "ہو ہو" کرنے لگا۔ بُل فائٹر بُل کے جتنے قریب ہو کر لڑے گا اتنا ہی یہ اس کے حق میں خطرناک ثابت ہو گا۔ سینگوں سے زخمی ہونے کا خطرہ بھی آدمی خود تخلیق کرتا ہے اگر وہ بُل فائٹنگ کے قاعدوں کی خلاف ورزی نہ کرے تو سینگ اس کے جسم سے ایک دو انچ کے فاصلے سے گزر جائیں گے اور وہ محفوظ رہے گا۔ کوئی بھی بُل فائٹر تبھی زخمی ہوتا ہے جب وہ وقت کا تعین نہ کر سکے اور گھومنے میں دیر کر دے اور یا پھر انتہائی ناتجربہ کار ہو۔

بُل فائٹر کو اپنے قریب دیکھ کر بُل کی ہمت بندھی اور اس نے پھر دھاوا بول دیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی بُل فائٹر نے کیپ اس انداز سے گھمائی کہ بُل کپڑے سے چھو کر اپنے زور میں میدان کے درمیان تک چلا گیا۔ پورا رنگ تالیوں سے گونج اٹھا۔ ایک دم میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ بُل رنگ کی ہر شے سفید ہو گئی۔ بُل فائٹر

سفیدی میں ڈوبا ہوا بُل سفید۔ جیسے ایک اوور ایکسپوزڈ تصویر کا نیگیٹو ہو اور پھر آہستہ آہستہ تمام چیزیں اپنی اصلی رنگت پر لوٹنے لگیں...... کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے آنکھیں ملیں تو ایک اور فلیش ہوا...... یا وحشت یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُدھر بُل فائٹر اپنے کمال دکھا رہا تھا اور اِدھر میری آنکھیں اس تیز روشنی سے چندھیا رہی تھیں۔ میں نے جھنجھلا کر ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں ملیں اور اپنے عین سامنے دیکھا۔ اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تمام تماشائی بُل فائٹ دیکھنے میں محو تھے۔

اب کی بار بُل فائٹر نے بُل کو اپنی جانب متوجہ کیا اور جونہی بُل حملہ آور ہوا، اس نے کیپ فضا میں لہرانے کی بجائے ایک دم سمیٹ لی۔ بُل جو کپڑے کے پیچھے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا کیپ کے سمٹ جانے سے ایک دم رُکا۔ اس کی اگلی دو ٹانگیں لڑکھڑائیں اور وہ گرتے گرتے بچا۔ یہ ویرونیکا انداز کی قسم "ری بولیرا" تھی جس میں ایک خاص طریقے سے کپڑا سمیٹنے کی وجہ سے بُل اگلی ٹانگوں پر گر جاتا ہے۔

تماشائیوں نے پھر دل کھول کر داد دی۔ بُل فائٹر ایک مرتبہ پھر بُل کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور اسی لمحے مجھ سے تین چار قطاریں آگے بیٹھی ہوئی ایک سنہرے بالوں والی لڑکی نے بُل رنگ سے منہ موڑا اور ایک دم نشست سے اُٹھ کر اپنے کیمرے کا رُخ میری جانب کر کے بٹن دبا دیا...... ایک فلیش ہوا...... اور میری آنکھوں کے سامنے ہر شے سفید ہو گئی۔ میں نے سر جھٹک کر فلیش کے خیرہ کن اثرات کو زائل کیا۔ وہ لڑکی اپنی نشست پر بیٹھی بڑے اطمینان سے بُل فائٹ دیکھ رہی تھی...... میں تلملا کر رہ گیا، آخر کر بھی کیا سکتا تھا۔!

بُل فائٹ کے ڈرامے کا پہلا ایکٹ ختم ہو چکا تھا۔ بُل فائٹر تماشائیوں کے نعرہ ہائے تحسین کے جواب میں کمر تک جھکا ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر بُل بڑی شان بے نیازی سے کھڑا پبلک کو گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بُل رنگ کی بجائے اپنی چراگاہ میں کھڑا ہو جہاں یہ ڈھیر سارے لوگ

اُسے خواہ مخواہ ستانے آگئے ہیں۔

ایک مرتبہ پھر صدر کی کیبن سے گھنٹی بجی اور بل فائٹ کا دوسرا حصہ شروع ہُوا۔ بُل فائٹر لکڑی کی گیلری کے پیچھے جا چکا تھا اور میدان میں سوائے بُل کے اور کوئی نہ تھا اب میدان میں ایک پکا دور "گھڑ سوار" داخل ہُوا۔ آنکھوں، کانوں اور ٹانگوں کے سوا گھوڑے کا تمام جسم روئی کے گدیلوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ گھڑ سوار کے ہاتھ میں ایک "پک" یعنی نیزہ تھا جس کی انی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ "پک آدور" یعنی نیزہ بردار۔ بل فائٹ کے اس حصے پر سب سے زیادہ نکتہ چینی ہوتی ہے کیونکہ اس کے دوران میں بے چارے گھوڑوں کی بے پناہ شامت آتی ہے۔ پکا دور کا سُست رو گھوڑا جسے شاید اپنے انجام کا علم تھا بے حد آہستہ چل رہا تھا اور بُل کے قریب جانے سے کترا رہا تھا۔ چوتھی قطار میں بیٹھی محترمہ نے بل رنگ سے منہ موڑا اور کیمرے کر کھڑی ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ بٹن دباتیں، میں نے شور مچایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری تصاویر کس خوشی میں بنائی جا رہی ہیں؟ وہ کمبخت بھینسا تو دوسری جانب اپنے جوہر دکھا رہا ہے۔"

سُنہرے بالوں والی محترمہ نے کیمرہ آنکھ سے ہٹایا اور نہایت بدتمیزی سے بولیں۔ "میں اس لیے تمہاری تصاویر کھینچ رہی ہوں کہ میرے خیال میں تم بھینسے سے زیادہ خوش شکل ہو۔"

میرے گرد بیٹھی ہوئی پبلک اس جواب پر بہت محظوظ ہوئی اور "اوے، اوے" کے نعرے بلند ہونے لگے، بلکہ ایک دو نے مجھے "تے تورو" کہہ کر بھی بلایا۔ میں کھسیانا ہو کر اپنی نشست میں دُبک گیا...... اُدھر فلیش ہُوا اور ہماری تصویر پھر اُتر گئی۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرا خیال ہے ایسے حالات میں ہر اس شریف آدمی کو پیچ و تاب کھانے کا حق ہے جس کی خوبصورتی کا پیمانہ ایک علاوہ کالے کلوٹے آدھ ٹن وزنی بھینسے کو ٹھہرایا جائے۔

پکا دور کا گھوڑا شاید اڑیل قسم کا تھا اُس نے بُل کے پاس جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ اس پر پکا دور نے پھر وہی "تے تورو، تے تورو" کی گردان کی۔ بُل گردن اُٹھا کر گھوڑے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے ایک ایسا عجیب الخلقت جانور کھڑا تھا جو اتنی گرمی کے باوجود بل رنگ میں رضائی اوڑھ کر آ گیا تھا۔ بُل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سرپٹ دوڑتا ہُوا آیا اور گھوڑے کے پیٹ میں ایک زوردار ٹکر رسید کی۔ اُس کے نوکیلے سینگ شاید گدیلے کی روئی میں سے گزر کر گھوڑے کی پسلیوں میں پیوست ہو چکے تھے کیونکہ گھوڑا لڑکھڑایا، مگر اسی لمحے پکا دور نے اپنے نیزے کی انی بُل کی گردن میں بھونک دی۔ بُل گھوڑے کی پسلیوں میں سینگ گھسیڑے جتنا زور لگاتا نیزے کی انی اس کی گردن میں اتنی ہی زیادہ دھنستی چلی جاتی۔ یہاں تک کہ اس کی گردن سے خون بہنے لگا اور تکلیف کی شدت سے بے بس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ بُل کی گردن میں زخم کرنے کا مقصد اس کی طاقت کو زائل کرنا ہوتا ہے، تاکہ اس کی تیزی سُست روی میں بدل جائے اور بعد میں بُل فائٹر اُس کے ساتھ اچھی طرح کھیل سکے۔ اس ایکٹ میں بُل کی بہادری کا امتحان ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک مرتبہ زخم کھا کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو تو اُسے بزدل سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ بُل اپنے گہرے زخم سے رِستے ہوئے خون کی پروا کیے بغیر نشانہ تاک کر پھر گھوڑے پر حملہ آور ہو گیا۔ اِدھر بُل کے سینگ گھوڑے کے پیٹ میں گھسے اُدھر پکا دور نے اپنا خون آلود نیزہ اس کے زخم میں گھونپ دیا۔ بُل جتنا آگے بڑھ کر گھوڑے کے پیٹ میں ٹکریں مارتا نیزے کی انی اتنی ہی گہرائی میں چبھتی چلی جا رہی تھی۔

میرے قریب بیٹھا موٹا ہسپانوی بُل کی اس بہادری پر نہال ہو رہا تھا اور بار بار اپنے ساتھی کو لعن طعن کر رہا تھا جس نے بُل فائٹ کے آغاز میں اس بُل کو بزدل کہنے کی جسارت کی تھی۔ یہ بہادر بُل اپنی گردن میں دھنسی ہوئی نیزے کی انی کی پروا کیے بغیر برابر گھوڑے کے پیٹ میں سینگ گھسیڑے اُسے گرانے کی

کوشش میں مصروف تھا۔ گھوڑا یوں کھڑا تھا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس وقت وہ سفید گدیلوں میں لپٹا گھوڑے سے زیادہ ایک بے ہنگم قسم کا پرندہ لگ رہا تھا۔ بُل کی قوی گردن۔ نوکیلے سینگ اور چوڑے کاندھے اس کے پیٹ میں گھستے گئے۔ یہاں تک کہ اس کی دوٹانگیں ہوا میں لٹک گئیں۔ سُم معلق ہوگئے۔ گردن جھک گئی اور بالآخر وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ گھوڑے کے زمین پر گرتے ہی پکا دور بھاگ کھڑا ہُوا۔ گھوڑا مر چکا تھا۔ زخمی بُل کی گردن سے خون رِس رِس کر اکھاڑے کی ریت پر گر رہا تھا۔ وہ سربلند کئے اکھاڑے کے گرد بھاگنے لگا۔ جیسے اپنی بہادری کی داد طلب کر رہا ہو۔ تمام لوگ اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور تالیاں بجا کر بل کی بہادری کا اعتراف کیا۔ اس دوران میں ایک اور پکا دور گھوڑے پر سوار میدان میں داخل ہُوا۔ نووارد نے جب اپنے بھائی کی خون آلود لاش میدان میں پڑی دیکھی تو ہنہنایا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔ لوگوں نے شور مچا دیا۔ شور سے بُل گھوڑے کی جانب متوجہ ہو گیا...... ایک اور شکار...... وہ اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہُوا اور پہلی ہی ٹکر سے گھوڑے کو گرا دیا۔ تماشائیوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

"سان سباستیان کے بُل رنگ میں اس سے بہادر بُل کبھی نہیں دیکھا گیا۔"

موٹے ہسپانوی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

اب میدان میں تیسرا پکادور داخل ہُوا۔ بُل حسب معمول نشانہ تاک کر پھر حملہ آور ہُوا مگر اس مرتبہ قسمت نے یاوری نہ کی اور اس کے سینگ گھوڑے کے پیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی پکا دور کا نیزہ اس کے کوہان میں اُتر گیا۔ اس نے زور لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر تازہ زخم میں اتنی تکلیف وہ موجودگی نے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ کثیر مقدار میں خون بہنے کی وجہ سے بُل کی طاقت میں کمی آ رہی تھی اور اب وہ خاصا شکست خوردہ ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بُل فائٹ میں گھوڑے

کا مرنا قدرتی بات ہے۔ بُل فائٹر کبھی کبھار مرتا ہے اور بُل ہمیشہ مر جاتا ہے۔ گھوڑے کی موت کا سب سے زیادہ افسوس غیر ملکی تماشائیوں کو ہوتا ہے جن کی اکثریت اس "بے رحمی" کی تاب نہ لاتے ہوئے بل رنگ سے واک آؤٹ کر جاتی ہے۔ تجربہ کار ہسپانوی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں اور فوراً اُن کی مہنگی نشستوں پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ چوتھی قطار میں بیٹھی غیر ملکی لڑکیاں بھی پکا دور کے عمل کے دوران آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زار و قطار روتی رہیں۔

صدر کے اشارے پر ایک مرتبہ پھر بُل رنگ میں بگل کی آواز گونج گئی۔ بُل فائٹ کا تیسرا ایکٹ شروع ہونے کو تھا۔ موسیقاروں کے طائفے نے بُل فائٹ کی مخصوص موسیقی کی دھن چھیڑ دی۔ بُل فائٹر دوبارہ میدان میں داخل ہُوا مگر اس مرتبہ اس کے ہاتھوں میں کیپ کی بجائے دو "باندریلو" تھیں۔ رنگین کاغذ میں لپٹی گز بھر لمبی اُس چھڑی کو کہتے ہیں جس کے سرے پر چھ انچ لمبی ایک برچھی لگی ہوتی ہے۔

بُل فائٹر بُل سے چند گز کے فاصلے پر بازو لٹکا کر کھڑا ہو گیا اور اُسے شُشکارا۔ بُل نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے بظاہر ایک نہتا آدمی کھڑا تھا اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ بُل فائٹر کے قریب آ کر اس نے اپنا سر جھکا لیا تاکہ اُسے سینگوں پر اُچھال دے۔ عین اُسی وقت بُل فائٹر نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور دونوں باندریلو بیک وقت گردن کے زخم کے قریب گاڑ دیں۔ تماشائیوں نے ایک مرتبہ پھر تالیاں بجائیں کیونکہ باندریلو مناسب فاصلے پر لگائی گئی تھیں اور گردن پر سیدھی کھڑی ہونے کی بجائے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، گردن سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ یہ عمل تین مرتبہ دہرایا گیا اور کل چھ باندریلو بُل کے جسم میں پیوست ہوئیں۔ اس حرکت کی خصوصیت یہ ہے کہ باندریلو ہاتھ اُٹھا کر اس طرح لگائی جائیں کہ بُل کے سینگ بُل فائٹر کے جسم سے چھو کر نکل جائیں۔ باندریلو کو بُل کی گردن کے زخم میں گاڑنا بیحد معیوب گردانا جاتا ہے۔

اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت بُل کو اعتماد تھا کہ وہ ہر شے کو فنا کر کے رکھ دے گا۔ وہ بُل فائٹر کے معاونین، لکڑی کی کیلری اور گھوڑوں پر وحشیانہ انداز میں حملے کر رہا تھا مگر اب نیزے کے ایک زخم کے علاوہ اس کے جسم میں پیوست چھ برچھیوں نے اُسے ایک تکلیف دہ احساس سے روشناس کروا دیا تھا۔ وہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہے۔ اس کا گھمنڈ خاک میں مل چکا تھا۔ اب وہ قدرے خوف زدہ تھا۔ انسان سے ہراساں...... انسان جس نے کھیل ہی کھیل میں اُسے بُری طرح گھائل کر دیا تھا۔ اب وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس فضول کھیل سے تنگ آ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کھیلنے کی بجائے کسی نہ کسی طرح اپنے دشمن کو ہلاک کر ڈالے۔

بُل فائٹنگ کا نکتۂ عروج بُل کی موت ہے۔ شروع سے لے کر اب تک تمام داؤ پیچ اسی ڈرامائی انجام کی خوبصورتی کو مدِنظر رکھ کر کھیلے گئے تھے۔ اس اختتامیے کو "ترسیو" یعنی موت کا کھیل کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح بُل اکھاڑے میں اکیلا کھڑا ہے۔ بگل بجتا ہے۔ بُل فائٹر میدان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اب "مولیتا" ہے۔ مولیتا سُرخ سرج کے اس کپڑے کو کہتے ہیں جو ایک چھڑی کے گرد لپٹا ہوتا ہے۔ یہ مولیتا بُل کی بقیہ طاقت کو ختم کرنے اور اُسے قتل کرتے وقت اس کا سر نیچا رکھنے کے کام آتا ہے۔ بُل فائٹر اکھاڑے کے درمیان چلتا ہوا صدر کی کیبن کے نیچے پہنچا اور صدر سے بُل کو قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے رُومال اٹھا کر اجازت دے دی۔

بُل فائٹر پیچھے مڑا اور اپنا خالی ہاتھ فضا میں بلند کر کے اعلان کیا کہ وہ اس بُل کو اپنی محبوبہ یا کسی عزیز دوست کی بجائے بُل رنگ میں موجود ہزاروں تماشائیوں کے نام کرتا ہے۔ بُل فائٹر کی اس جمہوریت پسندی کو سیٹیوں کی بوچھاڑ اور "براوو" کے نعروں سے نوازا گیا۔ دھوپ کی شدت میں اب کمی واقع ہو چکی تھی اور بُل رنگ کا نصف سے زیادہ حصہ چھاؤں میں جا چکا تھا۔ موت کے سائے روشنی کے تعاقب

میں تھے۔ بُل فائٹر نے جھک کر تماشائیوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی سنہری ٹوپی اُتار کر زمین پر دے ماری اور دائیں ہاتھ میں مولیتا اور تلوار پکڑے بُل کی جانب بڑھا۔ "ہو ہو" اس نے پکارا۔ بُل نے جنگی سر اٹھایا اور پھر تھکاوٹ اور زخموں سے چُور ہونے کے باوجود حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ بُل فائٹر نہایت نفاست سے پنجوں پر گھوما اور بُل مولیتا سے چھوتا ہوا آگے نکل گیا۔

"استائے تورو سابیے لاطین" ایک نوجوان نے بُل کی فراست اور بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔ "یعنی بُل لاطینی زبان خوب سمجھتا ہے۔"

بُل فائٹر نے متعدد بار بُل کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور پھر بڑی خوبصورتی سے اپنا بچاؤ کیا۔ ان حرکات کا مقصد بُل پر اس حد تک غلبہ پا لینا ہے کہ وہ تھک کر ایک ایسی جگہ کھڑا ہو جائے جہاں اُسے آسانی سے قتل کیا جا سکے۔ پوری بُل فائٹ میں یہ حرکات سب سے زیادہ خطرناک اور خوبصورت ہوتی ہیں اور یوں تیزی سے گزر جاتی ہیں جیسے حُسن کا ایک خیرہ کُن شرارہ چمک کر پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد بُل ہانپنے لگا۔ اس وقت وہ بے حد بھاری بھرکم محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کا سر جُھک رہا تھا۔ زخموں کی شدت سے اس کا گوبر اور پیشاب خارج ہو کر اکھاڑے کی ریت پر پھیل رہا تھا۔ یہاں یہ فرض کر لینا کہ بُل اب ختم ہو چکا ہے انتہائی بیوقوفی ہو گی۔ وہ اب بے حد خطرناک ہے۔ وہ صرف اُسی صورت میں حملہ آور ہو گا جب اُسے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین ہو جائے گا۔ بُل فائٹر مولیتا اپنے دائیں ہاتھ میں تھامے بُل کے بالکل قریب آ گیا۔ بُل پیچھے ہٹنے لگا یہاں تک کہ اُس سُرخ دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جس میں سے صرف پندرہ منٹ قبل اتنے غرور سے پھنکارتا ہوا نکلا تھا۔ ایسی حالت میں اکثر بُل اکھاڑے کے کسی ایسے کونے میں جا کھڑے ہوتے ہیں جو ان کے نزدیک محفوظ ترین

ہوتا ہے۔ اِسے "بُل کا گھر" کہتے ہیں۔ اگر بُل کو اس محفوظ جگہ کے اندر جا کر چھیڑا جائے تو بُل فائٹر کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے چنانچہ بُل فائٹر نے مولیتا بُل کے آگے ریت پر بچھا دیا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بُل نے مولیتا سونگھا اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتا اپنے "گھر" سے باہر نکل آیا۔

دھوپ ماند پڑ رہی تھی اور سان سباستیان کے سمندر سے آنے والی نم آلود ہوا میں خنکی نمایاں تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو خواتین گرمی کی وجہ سے پنکھے جھل رہی تھیں۔ اب انھوں نے گرم چادریں اوڑھ لیں۔ سارا ہجوم اس حیرت ناک ڈرامے کا نکتۂ عروج دیکھنے کے لیے دم سادھے بیٹھا تھا۔

بُل اب بے حد تھک چکا تھا۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں مگر اس کی نم آلود کالی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت تھی۔ اس نے اپنی رہی سہی طاقت مجتمع کر کے اپنی آنکھوں کی وحشت میں بھر دی تھی۔ ایک ایسی وحشت جو بڑے بڑے بہادر بُل فائٹروں کا پتہ پانی کر دیتی ہے۔ خانہ بدوش بُل فائٹر گالو جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے اس معاملے میں بے حد ڈرپوک تھا۔ اشبیلیہ کے بُل رِنگ میں جب وہ ریٹائر ہونے سے قبل اپنی زندگی کا آخری بُل قتل کرنے والا تھا تو اس نے وہ بُل اپنے بچپن کے دوست کے نام کرنے کا اعلان کیا: "اے میرے عزیز دوست! یہ بُل تمھارے نام پر قتل ہو گا۔ تم جو میرے دل میں رہتے ہو۔" اس نے جھک کر اپنے دوست سے کہا اور پھر اس کی نگاہ وہاں بیٹھے ہوئے ایک عظیم موسیقار پر پڑی۔ گالو نے فی الفور اپنا ارادہ بدل دیا۔ "اے آسمانِ موسیقی پر چمکنے والے تابناک ستارے یہ بُل میں تمھارے نام کرتا ہوں اور......" ابھی وہ فقرہ پورا نہ کر پایا تھا کہ اس نے اپنے اُستاد بُل فائٹر کو ہجوم میں بیٹھے دیکھا۔ "بھلا میں اپنے استاد الغا بینو کی موجودگی میں یہ بُل کسی اور کے نام کرنے کی جسارت کیونکر کر سکتا ہوں۔ یہ بُل تمھارے نام پر قتل ہو گا میرے اُستاد!"

اس نے اپنا ہاتھ شاہانہ طریقے سے فضا میں لہرا کر اعلان کیا اور بُل کو قتل کرنے کی نیت سے پیچھے مڑا۔ بُل سر جھکائے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ گالو نے اپنا گنجا سر کھجایا اور اکھاڑے میں موجود اپنے چھوٹے بھائی ہوسے کو کہنے لگا۔ "یار ہوسے تمھاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم اس بُل کو میری طرف سے مار دو۔ مجھے اس کا دیکھنا پسند نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی تلوار اور مولیتا زمین پر پھینکا اور لکڑی کی گیلری پھلانگ کر بُل رِنگ سے بھاگ گیا۔

مگر آج سان سباستیان کے اکھاڑے میں جو بُل فائٹر (بعد میں معلوم ہُوا کہ اس کا نام ہوسے مونتش ہے اور ہسپانیہ کے بہترین بُل فائٹروں میں شمار ہوتا ہے) سینہ تانے کھڑا تھا، وہ بُل فائٹر کی آنکھوں میں بھری وحشت سے ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہ ہُوا۔ مولیتا اور ننگی تلوار بائیں ہاتھ میں تھامے وہ بُل سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ بُل کی نظریں مولیتے پر جمی تھیں اور وہ بُت بنا کھڑا تھا۔ جب بُل فائٹر کو یقین ہو گیا کہ بُل اتنا تھک چکا ہے کہ اب اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا تو اس نے بُل کی طرف سے منہ موڑا۔ ایک جھٹکے سے مولیتا میں سے تلوار کھینچی اور پھر دوبارہ مڑ کر بُل کی جانب بڑھا۔

...... بے حد جچے تُلے قدموں سے۔ آہستہ آہستہ۔ اُس کے سر، تلوار کی نوک اور بائیں کاندھے کا رُخ بُل کی طرف تھا۔ بُل ایک خوفزدہ بچے کی طرح سہما کھڑا تھا۔ بُل فائٹر نے اب اُس چھوٹی سی جگہ کا تعین کیا جو بُل کے کندھوں کے درمیان اور سینگوں کے اُوپر ہوتی ہے۔ عین اس مقام پر اگر تلوار گھونپی جائے تو وہ ریڑھ کی ہڈی میں سے گزر کر بُل کا کام تمام کر دیتی ہے۔ گردن کا یہ حصہ بُل فائٹر کو صرف اس وقت نظر آتا ہے جب بُل حملہ آور ہو رہا ہو۔ گردن کے کسی اور حصے میں تلوار بھونکنا بزدلی اور ناتجربہ کاری پر محمول کیا جاتا ہے۔ اچھا بُل فائٹر مولیتا کے درست استعمال سے بُل کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ گردن نیچی رکھے

اور پھر خطرہ مول لے کر سینگوں کے اُوپر جھک کر وار کرتا ہے۔

آخری وار کرنے سے پہلے بل فائٹر نے اپنی تلوار کو بوسہ دیا اور اس کا دستہ آنکھوں کے پاس لا کر نوک بل کی جانب کر دی......

"ہے تورو" اُس نے بل کو پکارا۔

بُل نے بمشکل اپنا سر اُٹھایا۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی تلوار کا رُخ اُس کی جانب تھا۔ انصاف کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ انصاف جو ہمیشہ اصولوں کی بجائے طاقت کا ساتھ دیتا ہے...... اس وقت بُل فائٹر کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ بُل کا سر جھکا ہوا تھا لیکن کبھی کبھار مظلوم اپنے گہرے زخموں کے باوجود ظالم سے ٹکرا لیتے ہیں۔ بُل نے بھی اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا اور بچی کھچی طاقت سے کام لے کر بُل فائٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ اور پھر کچھ یوں ہوا کہ انسان اور حیوان ہم آغوش ہو گئے۔ حیوان کا سر نیچا۔ انسان اس کے سینگوں سے بچاؤ کرتے ہوئے اس کے اُوپر جھکا۔ تلوار گردن میں اُتار تا ہوا۔ بل کی گردن، تلوار کا دستہ اور انسان کا ہاتھ ایک نقطے میں بدل گئے۔ قتل کی خوبصورتی کا وہ لمحہ جسے بُل فائٹ کا فنی اور ریفر باقی نقطۂ عروج کہا جاتا ہے۔ بُل فائٹر نے تلوار کے خون آلود دستے سے انگلیاں علیحدہ کیں اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بل لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے منہ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا۔ اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ کون جانے اس آخری لمحے میں بُل نے نیم مردہ آنکھوں سے کتنی نفرت سے ان ہزاروں تماشائیوں کو دیکھا ہو گا جو اس کی موت کا تماشہ دیکھنے آئے تھے۔ بل فائٹر کولہوں پر ہاتھ رکھے نہایت سنجیدگی سے اختتام کا منتظر تھا۔ پورے بُل رنگ پر خاموشی طاری تھی۔ بُل کا سر نیچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی گردن اور منہ سے بہتا ہوا خون گرم ریت میں جذب ہو رہا تھا اور پھر اُس کی ٹانگیں بُری طرح لرزنے لگیں اور وہ لڑکھڑا کر ریت پر گر پڑا۔ موت کے سائے روشنیوں پر غالب آ گئے۔

بُل کے گرتے ہی بُل رنگ میں شور برپا ہو گیا۔ تلوار کے پہلے وار میں بُل کو ہلاک کر ڈالنا ایک عظیم کارنامہ تھا ورنہ اکثر تلوار کسی ہڈی سے ٹکرا کر باہر نکل آتی ہے اور بُل فائٹر اگر اناڑی ہونے کی وجہ سے متعدد بار کوشش کے باوجود بھی بُل کو ہلاک نہ کر سکے تو پھر اس کی شاہ رگ خنجر سے کاٹ دی جاتی ہے۔ لوگ اپنی نشستوں سے اُٹھ کر تالیاں بجا رہے تھے اور پھر یکدم بُل رنگ میں ہزاروں سُرخ رنگ کے ریشمی رُومال لہرانے لگے۔ عوام نے فیصلہ دے دیا تھا کہ بُل فائٹر کو اس کی بہادری کے صلے میں بُل کے کان اور دُم کاٹ کر دے دیئے جائیں۔ صدر کی منظوری پر بُل رنگ کے ملازمین نے ایک خنجر سے بُل کے کان اور دُم کاٹے اور دونوں "تحفے" بُل فائٹر کے حوالے کر دیئے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس کے فوراً بعد بے شمار لوگ اکھاڑے میں کُود پڑے اور بُل فائٹر کو کندھوں پر اٹھا کر ایک جلوس کی صورت میں بُل رنگ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تماشائی ابھی تک کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ جونہی بُل فائٹر ان کے قریب سے گزرتا وہ جو کچھ ہیں آتا اُٹھا کر اس کی جانب اُچھال دیتے۔ رومال، ہیٹ، پنکھے، کوٹ، ٹائیاں اور لاتعداد دوسری اشیا اکھاڑے میں بکھری پڑی تھیں۔

بُل فائٹر کے معاونین ان چیزوں کو اُٹھا کر بُل فائٹر کو دیتے اور وہ انہیں چوم کر واپس اچھال دیتا۔ میرے قریب بیٹھے دو ہسپانویوں میں سے ایک نے شراب کا مشکیزہ بُل رنگ میں پھینک دیا۔ بُل فائٹر نے مشکیزہ فضا میں ہی دبوچ لیا۔ اور اس میں سے چند گھونٹ بھر کر واپس پھینک دیا۔ مشکیزہ سب سے اگلی صف میں گرا۔ ایک تماشائی نے اٹھا کر چند گھونٹ لیے اور پچھلی صف میں کسی کو تھما دیا۔ اُن صاحب نے بھی "ٹیکٹ" لگا کر شراب پی اور اس سے پچھلی صف میں بیٹھے ایک لڑکے کو دے دیا۔ لڑکے نے بھی...... مشکیزہ موٹے ہسپانوی تک پہنچا تو تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنی خوش قسمتی پر پھولا نہ سما رہا تھا۔

"میں اس مشکیزے اور بقیہ شراب کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا تاکہ میرے بیٹے اور ہونے والے پوتے اس پر فخر کر سکیں کہ یہی ہے وہ مشکیزہ جس میں سے عظیم بُل فائٹر ہوسے ژنتش نے شراب پی تھی۔"

"اور اس کے بعد دو درجن تماشائیوں نے بھی......." میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں! میرا بس چلے تو میں بُل رِنگ میں بیٹھے تمام تماشائیوں کو شراب پلاؤں...... تو تم بھی پیو!" اس نے مشکیزہ میری گود میں رکھ دیا۔

"اگر بقیہ شراب میں پی گیا تو تمہارے پاس اپنے بیٹوں اور ہونے والے پوتوں کو دکھانے کے لیے کچھ نہ بچے گا۔" میں نے بچا ہوا مشکیزہ اُسے واپس کر دیا۔

جلوس کے خاتمے پر میدان میں فربہ خچروں کی ایک جوڑی داخل ہوئی جسے بُل رِنگ کے ملازمین ہانک رہے تھے۔ انھوں نے خچروں کے گرد بندھی رسیوں سے بُل کی ٹانگیں مضبوطی سے جکڑ دیں۔ اس کے بعد انھوں نے خچروں کو چابک کے ساتھ اتنی تیزی سے پیٹا کہ وہ وزنی بُل کو گھسیٹتے ہوئے میدان سے باہر نکل گئے۔ ریت پر مرے ہوئے بُل کے گھسٹنے سے ایک راستہ سا بن گیا تھا بُل فائٹ کے ڈرامے کے مرکزی کردار کی آخری راہگذر۔

ہر بُل فائٹ میں چھ بُل اور تین بُل فائٹر حصہ لیتے ہیں۔ ایک بُل کو مارنے کے لیے صرف بیس منٹ دیئے جاتے ہیں۔ سان سباستیان کے اکھاڑے میں پہلا بُل ہلاک ہو چکا تھا۔ اب دوسرے بُل کی باری تھی۔ بگل کی آواز آئی۔ بڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سرخ دروازہ زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بُل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ...... اُس کے بوجھ تلے زمین لرز رہی تھی۔ طاقتور، مغرور اور ناقابلِ تسخیر...... ہے تورو، ہے تورو، تماشائی اپنے رومال، ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خچروں کی جوڑی جب چھٹے اور آخری بُل کی لاش اکھاڑے میں سے اصطبل کی جانب گھسیٹ رہی تھی تو بُل رِنگ پر سُورج غروب ہو چکا تھا۔ کل صبح ان کا گوشت سان سباستیان کے قصابوں کی دکانوں پر مہنگے داموں فروخت ہوگا۔ میڈرڈ کے بُل رِنگ میں مرنے والے بُل کا گوشت تو جنرل فرانکو بھی بے حد رغبت سے کھاتا ہے۔

آخری بُل کی لاش میدان سے جاتے ہی تماشائی تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بُل رِنگ خالی ہونے لگا۔ میں جانے کے لیے اُٹھا تو پھر ایک مرتبہ میری آنکھوں میں فلیش کی روشنی چھپ گئی۔ سنہری بالوں والی لڑکی نے کیمرہ اپنی آنکھ سے ہٹایا اور مسکرا دی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح تصویریں اُتارنے سے اس کا کیا مقصد ہے! وہ بھی ایک ایسے کھیل کا آغاز کرنا چاہتی تھی جس میں وہ بُل فائٹر ہو اور میں بُل...... بُل فائٹر جو اکثر بچ جاتا ہے اور بُل...... جو ہمیشہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

گرم خُوشبو کی شام

گرما کی اُس سُہانی شام کو جب سان سباستیان کے حسین سمندر پر شفق سُرخ ہو رہی تھی، بُل رنگ میں سے ایک جلوس نکلا۔ خون، ریت اور پسینے میں نہائے ہوئے بُل فائٹر کو تماشائیوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ شفق کی سُرخی میں ان کے چہرے ان بہادروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے جنھوں نے کسی قدیم رُومی اکھاڑے میں جنگلی شیروں کو پچھاڑا ہو۔ موسیقاروں کا ایک گروہ ان کے گرد گھیرا ڈالے ہسپانوی موسیقی "فلیمنکو" کی تانیں اُڑا رہا تھا۔ سفید بالکونیوں پر جھکی بڑی بڑی آنکھوں والی ہسپانوی دوشیزائیں اُن پر پھول نچھاور کر رہی تھیں۔ میں بھی اس جلوس کے ساتھ ہو لیا۔ اکثر لوگوں کے کندھوں پر شراب کے مشکیزے تھے جنھیں وہ منہ کے پاس چھلکاتے تو سُرخ شراب کی ایک پتلی سی دھار ان کے حلق میں اُتر جاتی........ وہ اس معاملے میں بے حد فراخ واقع ہوئے تھے اور ہر ایک کو اپنا مشکیزہ پیش کر رہے تھے........ شمالی یورپ میں جہاں کہیں لوگوں کا جمگھٹا ہوتا میں ان سب میں اپنے گندمی رنگ اور سیاہ بالوں کی وجہ سے علیحدہ نظر آتا مگر یہاں اس ہسپانوی ہجوم میں شامل اکثر افراد پاکستانی لگ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی ہسپانوی اپنی زبان میں مجھ سے بُل فائٹ کے بارے میں کچھ کہتا تو میں صرف مسکرا دینے پر ہی اکتفا کرتا۔ جلوس شہر کے درمیان پلازا میئر میں پہنچا۔ چوک کا ایک چکر لگایا اور پھر منتشر ہو کر آس پاس کے قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں سما گیا۔

میں تھکے ہوئے قدموں سے سان سباستیان کے ساحل کی جانب چل دیا۔ بُل فائٹ نے میرے اندر ایک عجیب سی اُداسی بھر دی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ اس بارے میں ہسپانوی نکتہ نظر درست ہے جو کہتے ہیں کہ اتنی ڈھیر ساری خوبصورتی کے لیے بُل کا قتل جائز ہے یا اُن غیر ملکیوں کا اعتراض بجا ہے جن کے نزدیک یہ کھیل وحشیانہ ہے۔

ساحلی سڑک پر خوب رونق تھی۔ بُل فائٹ دیکھنے کے بعد اکثر لوگ سمندر کی تازہ ہوا اور خوشگوار شام کی خنکی کا لُطف اُٹھانے ادھر آ نکلے تھے۔ یہ ساحلی سڑک بُل رنگ سے شروع ہو کر پہاڑی پر واقع قلعے کے گرد چکر کاٹ کر شہر کے دوسرے سرے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ پہاڑی کی اوٹ میں لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کیبن تھے جن کو رنگ برنگے قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ ان کیبنوں کے آگے سے ساحلی سڑک گزرتی تھی۔ سڑک کے پہلو میں خاموش سمندر لیٹا ہوا تھا۔ یہ مچھیروں کی بستی تھی۔ سارا دن ان کیبنوں میں سمندر سے پکڑی ہوئی مچھلی فروخت ہوتی تھی اور رات کو ان میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں رکھ کر انھیں ہوٹلوں میں بدل دیا جاتا تھا۔ یہاں بھی بے شمار لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں پاس سے گزرا تو لوگوں کی میزوں پر رکھی ہوئی خوراک میں سے اٹھتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبو نے میرے نتھنوں میں گھس کر اعلان کر دیا کہ میاں صاحبزادے اُن انگریزی ناشتوں کی پائی ہوئی جائے اور بسکٹ تو کب کے ہضم ہو چکے۔ صرف سمندر کے کنارے چہلک لبیہ کھیلنے اور بُل فائٹ دیکھنے سے کام نہیں چلے گا، کچھ پیٹ پوجا بھی ہو جائے۔ میں اندر چلا گیا اور بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی تلاش کرنے لگا۔ پوری کیبن ٹھُسی پڑی تھی۔ ایک لمبی میز پر کھانے اور خاص طور پر پینے کی چیزوں کے انبار لگے تھے۔ تمام کرسیاں پُر تھیں۔ چند افراد میز پر دھرنا مارے مشکیزوں میں سے شراب پی رہے تھے۔ ہسپانوی موسیقاروں کا جو طائفہ جلوس کے ہمراہ تھا اب یہاں گھوم پھر کر موسیقی بجا رہا تھا اور پیسے اکٹھے کر رہا تھا۔ ایک خوش باش

موٹی تازی ویٹرس میزوں کے گرد یوں پھرتی سے گھوم رہی تھی جیسے چابی کی گڑیا۔ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر وہ میرے پاس چلی آئی۔

"کومیدا"؟ اس نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ہسپانوی میں پوچھا۔

"ہاں ہاں کومیدا۔" میں نے جواب دیا۔

اُس نے جھٹ سے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے کھینچتی ہوئی میز کے سرے پر ایک بوڑھے کے پاس لے گئی جو سر جھکائے اُونگھ رہا تھا۔

"ہے انتونیو!" اس نے بوڑھے کا کندھا پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔

"کے اُستا سینیوریتا!" حضرتِ انتونیو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

"سالیدا" ویٹرس نے انگوٹھے سے باہر کی طرف اشارہ کر دیا۔

بوڑھے نے میز پر رکھی سُرخ شراب کی بوتل بغل میں دابی اور آنکھیں ملتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔ یہ بوڑھا آج دوپہر ہزاروں نگاہوں کا مرکز تھا۔ اصطبل کا دروازہ کھول کر بُل کو میدان میں چھوڑنے والا بوڑھا۔

"کے بان؟" کرسی پر بیٹھتے ہی ویٹرس نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے ساتھ والے صاحب کی پلیٹ کن اکھیوں سے دیکھی۔ تلی ہوئی ننھی مُنی مچھلیاں۔

"مچھی" میں نے مزا لیتے ہوئے کہا۔

"ماچی"؟ ویٹرس نے ٹھوڑی پر انگلی جما کر حیرت سے پوچھا اور پھر فوراً ہی ہنس دی۔ "آ......پسکادو!"

تھوڑی دیر میں وہ آپسکادو یعنی مچھلی کی ایک پلیٹ لے آئی۔ ایک پیاز، ڈبل روٹی اور کسی مشروب کا ایک مگ بھی ساتھ تھا۔ درجن بھر سارڈین مچھلیاں اپنی اصلی حیثیت میں تھیں یعنی اگر وہ تلی ہوئی نہ ہوتیں اور انھیں پانی میں ڈال دیا جاتا تو فوراً تیرنے لگتیں۔ میں نے ایک کو انگلی سے چھوا۔ بے حد گرم تھی۔ میں اُ

دُم کو علیحدہ کر کے میں نے اُسے ڈبل روٹی کے بیچ میں رکھا اور پیاز کے ساتھ کھانے لگا۔ بے حد خستہ اور مزیدار تھی۔ استنبول میں بکنے والی مچھلی کی طرح...... میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ مچھلی کھانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر آج کی بُل فائٹ کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہے تھے۔

"چوتھے بُل کی دائیں آنکھ کمزور تھی۔ بُزدل بھی تھا۔" میں نے پیاز چباتے ہوئے یونہی ہانک دی۔

تمام لوگ خاموش ہو گئے۔

شاید میں نے غلط کہہ دیا تھا۔ میں نے بمشکل پیاز نگلا اور شرمندہ ہو کر کہا۔

"میں نے غور نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے بائیں آنکھ ہو۔ بُل شاید بہادر......"

"نہیں نہیں۔" ایک تنومند ہسپانوی نے منہ کھول کر ایک سالم مچھلی اس میں گرائی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ دائیں آنکھ کمزور تھی اور وہ بزدل تھا۔ ہم بھی تو اسی بات پر بحث کر رہے تھے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"آہا!" میز کے آخری سرے پر بیٹھے ایک صاحب نے میری جانب اشارہ کر کے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیئے۔ "انکسی نادو!"

انکسی نادو اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بُل فائٹ کا شوقین ہو اور اُسے خوب سمجھتا ہو۔ میں نے انکسی نادو کا خطاب ملنے پر ایک سالم مچھلی نگل لی۔ دُم آنکھوں اور سر سمیت۔ ذائقہ قدرے مختلف تھا۔

جب کبھی ویٹرس آتی ایک دل پھینک بوڑھا سینے پر ہاتھ رکھ کر کوئی رومانوی مکالمے ادا کرنے لگتا۔ تمام لوگ بے حد محظوظ ہوتے اور ویٹرس بھی آنکھیں مٹکا کر ہنستی ہوئی چلی جاتی۔ ہمارے سامنے ساحلی سڑک پر بے شمار لوگ بے مقصد گھوم رہے تھے۔ چند ایک میری طرح تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو کے آگے ہتھیار ڈال دیتے

اور جیب میں سکے ٹٹولتے کیبن کے اندر آجاتے۔ ریٹرک کے ساتھ ہی مٹیالا سمندر شروع ہو جاتا تھا۔ سمندر کے درمیان سانتا کلارا کا خوبصورت جزیرہ کھڑا تھا، جس کی مدھم روشنیاں گھپ اندھیرے میں جگنوؤں کی مانند ٹمٹما رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر سان سباستیان کی کونچا بیچ کے کنارے مہنگے ہوٹلوں کی عمارتیں بجلی کے بڑے قمقموں سے روشن تھیں۔ ساحل کے ساتھ مچھیروں کی بے شمار کشتیاں پانی میں جھول رہی تھیں۔ انہی کشتیوں میں پکڑی جانے والی مچھلی اس وقت تلی ہوئی حالت میں میری پلیٹ میں موجود تھی۔ لہروں کی نرم چھپاک چھپاک کیبن میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے شور کے باوجود مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ یک دم میرے حلق میں کانٹا چبھ گیا۔ میں نے بے دھیانی میں شاید مچھلی کو اچھی طرح ٹٹولا نہ تھا۔ مگ اٹھا کر میں نے جلدی سے ایک دو گھونٹ نگل لیے۔ عجیب قسم کا مشروب تھا۔ میں نے مگ اٹھا کر سونگھا۔ سفید رنگ کا شربت تھا شاید۔

"شراب نہیں ہو سکتی۔" میں نے سوچا "شراب تو کڑوی ہوتی ہے۔"

موسیقار اب عین میرے سر پر کھڑے کوئی گیت الاپ رہے تھے۔ گیت میں اُداسی اور محرومیت کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے جیب سے پانچ پیسیتے کا ایک سکہ نکال کر گٹار بجانے والے کو تھما دیا۔

"گراسیا سینیور!" اُس نے جھک کر کہا اور وہ آگے بڑھ گئے۔

سمندر سے آتی ہوئی نم اور خوشگوار ہوا کیبن میں بیٹھے ہوئے خوش باش لوگوں کی ہنسی اور گفتگو کا ملا جُلا شور، ہسپانوی موسیقی اور گرم مچھلی۔ بات ہوئی نا۔ میں نے سوچا۔ اور پھر مجھے لاہور کی کڑکتی گرمیوں کی وہ دوپہریں یاد آگئیں جب میں سارا سارا دن اپنی دکان پر بیکار بیٹھا سامنے سے گزرنے والی گرد آلود سڑک کو بے دھیانی سے تکتا رہتا۔ بس یونہی باہر دیکھتا رہتا۔ بیکاری اور بوریت، کبھی کبھار کوئی ریڑھا یا تانگہ گزر جاتا اور چمکتی دھوپ میں گھوڑے کی گردن میں

بندھی گھنٹیوں کی آواز دیر تک معلق رہتی۔ سڑک کے پار پان سگریٹ کی دکان کا گنجا مالک بچی پان کی گلوری منہ میں ٹھونسے اُونگھ رہا ہوتا۔ ساتھ والا سبزی فروش تاج ایک گندے ٹین میں گدلا پانی بھر کر اپنی باسی سبزیوں پر چھڑکتا اور چٹائی بچھا کر وہیں سو جاتا۔ مریل اور خارش زدہ آوارہ کتے میری دکان کے آگے فٹ پاتھ پر پھینکے دوپہر کے کھانے کی ہڈیاں سونگھتے اور پھر منہ میں دبا کر دُم ہلاتے شربت والے حکیم صاحب کی دکان کے تھڑے کے نیچے جا بیٹھتے۔ "سلام باؤ جی!" سڑک کا خاکروب مجھے ہمیشہ سلام کر کے گزرتا۔ اُسے ہر جمعرات کو ایک اٹھنی ملتی تھی۔ اور پھر ریڑھیوں پر پھل لگا کر بیچنے والوں کی مسلسل آوازیں "آنے پا۔ آنے پا۔ کھٹا نہیں کھانا میٹھے بڑے جے۔ چار آنے سیر۔" جانے وہ کیا بیچتے تھے۔ میں اپنے ذہن کا دریچہ آہستہ سے کھول دیتا اور پھر اس سے پرے یہ دریچے خود بخود کھل جاتے۔ ہر ایک میں سے یادوں کے حسین لمحے انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے اور باہر جھانکنے لگتے۔ سری نگر کی جھیل میں کنول کے چوڑے پتے، وادیٔ نیلم کی نیلی جھیلیں، روم کے فواروں کی پھوار، دریائے سین کے کنارے ایک حسین شام، سوئٹزرلینڈ کی جھیل...... آنے پا۔ آنے پا۔ کھٹا نہیں کھانا، میٹھے بڑے جے......

ذہن پر یکدم ہتھوڑے چلتے اور تمام دریچے کھٹا کھٹ بند ہونے لگتے۔ پچھلے پہر سامنے والا پنساری دکان سے باہر آکر اوپر مکان میں سوئے ہوئے اپنے کاہل بیٹے کو لگاتار آوازیں دینے لگتا "یوسف اوئے۔ اوئے یوسف۔" میرے ذہن کے دریچوں کے کواڑ اب زور لگانے سے بھی نہ کھلتے...... پیرس کا پھولوں کا بازار آنے پا...... وینس کے گنڈولے چار آنے سیر۔ سوئٹزرلینڈ۔ یوسف اوئے یوسف، سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا۔ اور اب اس وقت اِس سان سباستیان کے سمندر سے آتی ہوئی نم اور خوشگوار ہوا۔ سانتا کلارا کے جزیرے میں چمکتے ہوئے جگنو۔ ہسپانوی موسیقی اور گرم مچھلی، لیکن کب تک! یہ سب کچھ بھی تو عارضی ہے۔ پھر وہی کڑکتی گرمیوں کی

دوپہریں ہوں گی۔ گرد آلود ٹرک، ریڑھے اور تانگے، پچی پان فروش، تاج سبزی والا، مریل آوارہ کتے، لاوارث گائیں، شربت والے حکیم صاحب، خاکروب "سلام باؤجی"۔ سان سباستیان کی ایک شام آنے پا، بل فائٹ چار آنے سیر۔ ہسپانیہ یوسف او ئے یوسف۔

یکدم روشنی ہوئی...... فلیش...... میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں لاہور کی گوالمنڈی سے پلک جھپکتے ہی سان سباستیان کے حسین ساحل پر تھا۔ میز کے سرے پر وہی بل فائٹ والی لڑکی کیمرہ آنکھوں سے لگائے بیٹھی تھی۔ دو خوش شکل ہسپانوی لڑکے اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ لڑکی نے کیمرہ آنکھوں سے ہٹایا اور ہاتھ ہلا کر زور سے کہنے لگی "ہیلو بل" تمام لوگ ہنسنے لگے۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ سنہری بالوں والی لڑکی آنے پا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ سلگا لیا اور ساحلِ سمندر پر بے مقصد گھومنے والوں کو بغیر کسی مقصد کے دیکھنے لگا۔

"آہم! دیکھئے۔" میں نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کالے سوٹ اور باؤلر ہیٹ میں ملبوس ایک نوجوان انگریز اکڑا اکڑا کھڑا تھا۔ "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے!"

"کیا یہ......" اس نے پلیٹ میں پڑے مچھلیوں کے سروں کی طرف اشارہ کیا۔ "مچھلی کھائی جا سکتی ہے؟"

"مچھلی کھائی جا چکی ہے، یہ صرف اس کے سر اور دُمیں ہیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"شاید آپ بُرا مان گئے۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "میں لندن سے بذریعہ ہوائی جہاز آج ہی سان سباستیان پہنچا ہوں۔ مجھے چونکہ ہسپانوی خوراک

کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں، اس لیے کھانے سے قبل تحقیق کر لینا مناسب جانا۔"

بنیانوں اور ڈھیلے گلے کی قمیصوں میں ملبوس اس ہسپانوی ہجوم میں کسی کاک ٹیل پارٹی کے لیے موزوں لباس پہنے یہ صاحب بالکل مُچند لگ رہے تھے۔

"میں بھی آج ہی پیرس سے یہاں آیا ہوں۔" میں نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا چباتے ہوئے کہا۔ "تلی ہوئی سارڈین مچھلی بے حد مزیدار ہے اور صرف دس پیسیتے میں۔"

"لیکن سارڈین تو کبھی تل کر نہیں کھائی جاتی۔ اس قسم کی مچھلی تو صرف بیرکے میں بھگو کر ٹین میں بند کرنے کے لیے موزوں ہے۔" اس نے بالائی ہونٹ دانتوں میں دبا کر لاپرواہی سے کہا۔

"آپ اپنی شکایت اس کیبن کے مالک مچھیرے سے کیجئے، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" میں قدرے جھنجھلا گیا۔

"شاید یہ کرسی خالی ہے۔" اس نے میرے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر جیب سے سفید رومال نکال کر کرسی کی سطح پونچھی۔ ہیٹ اتار کر میز پر دھرا، بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بور کریں گے یہ حضرت" میں نے دل میں سوچا اور پھر سمندر میں جھولتی ہوئی کشتیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ ویٹرس کمبخت کہاں چلی گئی ہے۔ اس ریستوران کی سروس اتنی بُری ہے کہ اگر لندن میں ہو تو ایک دن نہ چلے۔" وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ناک چڑھا کر بولے۔

اکثر انگریز سیاح جب یورپ کی سیر کو نکلتے ہیں تو ان کے دماغ میں برطانیہ کی گنائی ہوئی عظمت کا کروفر عود کر آتا ہے۔ وہ یورپ میں بسنے والی ہر قوم میں کیڑے نکالتے ہیں۔ جرمنوں کو آداب کا علم نہیں۔ فرانسیسی کینچوے کھاتے ہیں،

اطواری گرگٹ ہوتے ہیں اور ہسپانیوں کے جسم سے بُو آتی ہے۔ وہ اپنی پوری چھٹیاں گردن اکڑائے، ہر شے پر ناک بھوں چڑھاتے لندن کے بوسیدہ شراب خانوں کی یاد میں آہیں بھرتے گزار دیتے ہیں۔ بلکہ ایک انگریز بوڑھا تو ہر اتوار کو پیرس صرف اس لیے جایا کرتا تھا کہ وہاں کی "انگلش پب" میں بہترین انگریزی شراب ملتی ہے۔ یہ صاحب بھی شاید اسی قبیل کے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ویٹرس کا ادھر سے گذر ہُوا تو اس نے آرڈر پوچھنے کا تردد کیے بغیر ٹرے میں رکھی درجن بھر پلیٹوں میں سے ایک ان اینٹھے ہوئے صاحب کے آگے دے ماری۔

"لیکن دیکھیے ...... میں نے کہا مس!" انھوں نے گھبراہٹ میں ویٹرس کو پکارا مگر وہ واپس جا چکی تھی چنانچہ مجھ سے مخاطب ہو گئے "مگر میں نے تو یہ ڈش نہیں منگائی۔ ویٹرس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کھانا لگانے سے قبل مجھے مینو دکھاتی۔"

"اس ریستوران میں مینو وغیرہ نہیں ہوتا صرف ایک ہی ڈش ملتی ہے۔ گرم سارڈین مچھلی۔" میں نے ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اُکتا کر کہا۔ یہ صاحب سان سباستیان کی ایک خوبصورت شام کا ستیاناس کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

"یم یم یم" صاحب نے مچھلی منہ میں ڈالتے ہی چٹخارے لینے شروع کر دیے اور پھر یکدم سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے "آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے بلاوجہ آپ پر شک کیا۔ ایسی مزیدار مچھلی تو ہاؤس آف لارڈز میں بھی نہیں ملتی۔"

"ہاؤس آف لارڈز؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ صاحب کوئی بگڑے ہوئے لارڈ قسم کی چیز ہیں۔

"ہاں! ہاؤس آف لارڈز۔" انھوں نے ڈبل روٹی کے ٹکڑے سے مچھلی کا مصالحہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں پچھلے دس برس سے ویٹر کی حیثیت میں ملازم ہوں۔"

تو وہ لارڈ کی بجائے لارڈز کے ویٹر تھے تبھی کھانے اور سروس کے بارے میں اتنی چھان پھٹک ہو رہی تھی۔

مچھلی ختم کرنے کے بعد صاحب نے ایک بوتل سُرخ شراب چڑھائی اور باقاعدہ بہک گئے "میں نے تو ہاؤس آف لارڈز کے خنک کمروں میں اُونگھتے ہوئے کھوسٹ بوڑھوں کو چار بجے کی چائے پلاتے پلاتے زندگی برباد کی ہے ...... زندگی تو اسے کہتے ہیں۔" انھوں نے میز پر بیٹھے بے فکرے ہسپانویوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "گرم سارڈین مچھلی، سُرخ شراب، سمندر کی خوشگوار ہوا اور ...... میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ ہاؤس آف لارڈز کی بیراگیری چھوڑ کر یہاں ایک کشتی خرید لوں اور سارڈین مچھلیاں پکڑا کروں۔"

"نیک خیال ہے۔" میں نے اُکتا کر کہا۔ میں اب سوچ رہا تھا کہ ان صاحب سے کسی طرح پیچھا چھڑا کر ہوسٹل کی راہ لوں۔

"معاف کیجیے گا۔" وہ لڑکھڑا کر اُٹھے۔ اپنی ٹائی اُتار کر جیب میں رکھی اور کوٹ اُتار کر میز پر رکھ دیا۔ میز پر پڑے ہوئے ہیٹ کو اُٹھا کر انھوں نے قریب سے گزرتی ہوئی ویٹرس کے سر پر جما دیا۔ ویٹرس نے آنکھیں مٹکائیں اور ہیٹ اُتار کر اُن کی خالی بوتل پر ٹکا دیا۔

ایک اور فلیش ہوا۔ بُل فائٹ والی محترمہ۔ وہ میز سے اُٹھ کر اپنے ہسپانوی دوستوں کے ساتھ باہر جا رہی تھی۔ "خدا حافظ بُل!" اس نے جاتے جاتے کہا۔

"شاید اس محترمہ سے آپ کی دُعا سلام ہے۔" صاحب نے مجھے ٹھوکا دیا۔

"ہاں! بُل فائٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"بُل فائٹ؟ نہایت ظالمانہ کھیل ہے۔" انھوں نے منہ بنا لیا۔ "میں بھی آج دوپہر دیکھنے کی نیت سے گیا تھا۔ معلوم ہوا صرف تین سو پسیتے والا ٹکٹ مل سکتا ہے ...... ایک بُل فائٹ میں چھ بُل، یعنی پورے پچاس پسیتے کا ایک بُل پڑا۔ مہنگا

سودا تھا۔ کیوں جناب ؟ پچاس پسیتے میں ایک شریف بُل کو قتل ہوتے دیکھنا کہاں کی عقلمندی ہے ؟ اس رقم سے سارڈین مچھلی کی دو پلیٹیں آ سکتی ہیں۔ سارڈین مچھلی ؟ ہاں سارڈین .... ویٹرس جانے کہاں مرگئی ہے ہیں ایک پلیٹ مچھلی اور کھاؤں گا بلکہ سُرخ شراب ......" وہ باتیں کئے جا رہا تھا " ہاں سُرخ شراب ...... ہسپانیہ کی سُرخ شراب۔ ویٹرس ! میں خود اُسے ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔"

صاحب نے خالی بوتل جس پر پیسے اٹکا ہوا تھا ، اٹھائی اور ویٹرس کی تلاش میں باورچی خانے کی جانب چل دیئے۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے اٹھ کر ساحلی سڑک پر آ گیا۔ چند ایک غیر ملکی جوڑوں کے علاوہ سڑک پر اب بے حد کم لوگ رہ گئے تھے۔ میں پیدل ہی ہوسٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اگر یہ سب عارضی ہے تو بھی کیا ! سانتا کلارا کے جزیرے میں ٹمٹمانے والے جگنو زندگی کے تاریک لمحوں میں چمک اٹھیں گے۔ اس خوبصورت شام کی ٹھنڈی ہوا لاہور کی تپتی دوپہروں میں بھی میرے رخساروں سے چھو کر مجھے ٹھنڈک اور سکون کا احساس دلائے گی میں نے اپنے اندر خوبصورتی کا ذخیرہ کر لیا ہے اور یہ خوبصورتی مجھے آنے والی کل کی دشواریوں کا سامنا کرنے کے قابل بنا دے گی۔

ہوسٹل کے قریب پہنچ کر میں نے مڑ کر ساحل کی جانب نگاہ کی۔ سان سباستیان کے آسمان پر چمکنے والے تارے اور سانتا کلارا کے جگنو آپس میں گھل مل رہے تھے۔

بد بخت قشتالیہ

سانتا کلارا کے جزیرے اور اس کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے وسیع سمندر پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ اگلڈو اور اُرگل پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گھنے اور سیاہ بادل اُترے ہوئے تھے۔ ساحلی سڑک کے فٹ پاتھ پر لگے ہوئے درختوں کے پتوں میں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ کونچا بیچ بالکل ویران پڑی تھی۔ سمندر کا پانی اُتر جانے سے دُور دُور تک ایک دلدل سی بن گئی تھی۔ مچھیروں کی بستی بھی دھند کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی۔ سانتا کلارا کے ساحل پر لنگر انداز کشتیاں سمندر میں تلاطم کے باعث بُری طرح ڈول رہی تھیں۔

آج صبح جب میں پامپلونا جانے کی غرض سے یُوتھ ہوسٹل سے باہر نکلا تو پچھلی شب کا نیلا آسمان گھنے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ساحلی سڑک تک پہنچتے ہی تیز بارش شروع ہو گئی اور مجھے ایک ہوٹل کے برآمدے میں پناہ لینی پڑی۔ مجھے ان انگریز بوڑھیوں کا خیال آ گیا جن کی مدد سے ہم نے کل صبح کرنسی تبدیل کروائی تھی۔ وہ ضرور اس وقت ہوٹل کے مینیجر پر برس رہی ہوں گی۔ "پیڈرو کے بچے تم نے ہماری چھٹیوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ سان سباستیان میں تو پچھلے بیس روز سے لگاتار بارش ہو رہی ہے۔"

میں نے سامان کے تھیلے میں سے ہسپانیہ کا نقشہ نکالا اور اپنے سفر کے راستے کا تعین کرنے لگا۔ آج شب پامپلونا میں بسر ہو گی۔ کل شام تک ہسپانیہ کے صدر

مقام میڈرڈ پہنچ جاؤں گا۔ وہاں سے میرا رُخ دریائے وادی الکبیر کے آہستہ رو پانیوں کے کنارے آباد بزرگ شہروں قرطبہ اور اشبیلیہ کی جانب ہو گا اور پھر غرناطہ...... جہاں الحمرا کے پُر فسوں ایوان، غلام گردشیں اور سُرخ بُرج میری راہ تک رہے تھے...... مجھے تسخیر کر لینے کے لیے! پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ میں بذریعہ بس پامپلونا تک سفر کروں مگر یوتھ ہوسٹل میں مقیم ایک فرانسیسی سیّاح نے مجھے ہچ ہائکنگ کے ذریعے سفر کرنے کا مشورہ دیا۔ بقول اس کے ہسپانیہ میں لفٹ حاصل کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ چنانچہ اب میں پامپلونا جانے والی شاہراہ کی تلاش میں ادھر آنکلا تھا۔ بارش قدرے دھیمی ہوئی تو میں نے نقشہ لپیٹ کر تھیلے میں رکھا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک سرنگ آئی۔ یہ سرنگ سان سبستیان کی حدِ آخر تھی۔ سرنگ کے دوسری جانب میں نے سامان سڑک کے کنارے نم آلود گھاس پر رکھا اور کھڑے ہو کر لفٹ کا انتظار شروع کر دیا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی۔ ایک دو کاریں رُکیں مگر ان کی منزل ہسپانیہ کی بندرگاہ بلباؤ تھی جو پامپلونا سے بالکل مخالف سمت میں واقع ہے۔

مجھے وہاں کھڑے تقریباً دو گھنٹے گذر گئے مگر کوئی لفٹ نہ ملی۔ بارش کا پانی درختوں کے پتوں میں سے رِس رِس کر میری برساتی کے کالر کے اندر تک جا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اُس فرانسیسی سیّاح کو کوس رہا تھا۔ اگر میں اُس کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو اس وقت یہاں بھیگنے کی بجائے پامپلونا کے کسی آرام دہ قہوہ خانے میں بیٹھا گرم گرم کافی پی رہا ہوتا۔ خاصی دیر بعد سرنگ میں سے ایک جیپ نکلی۔ میں نے انگوٹھے کو خم دے کر ہاتھ آگے کر دیا۔ جیپ پہلے تو تیزی سے میرے پاس سے گذر گئی مگر جانے ڈرائیور کو کیا خیال آیا، اس نے ایکدم بریک لگائی اور مجھ سے کافی فاصلے پر جا کر رُک گیا۔ میں نے جلدی سے سامان کا تھیلا کاندھے پر ڈالا اور بھاگتا ہوا جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ مڈگارڈ پر جلتا ہوا

یونین جیک لہرا رہا تھا اور ڈرائیور کی نشست پر ایک عجیب الخلقت قسم کی شے براجمان تھی۔ اُس کے بھورے بال کندھوں تک آئے ہوئے تھے اور گھنی داڑھی چھاتی پر اُگے ہوئے بالوں سے اُلجھ رہی تھی۔ گھٹنوں تک آئی ہوئی ایک براؤن نیکر کے علاوہ ان صاحب کے جسم پر اور کوئی لباس نہ تھا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور پھر انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے کہنے لگا "کہاں جاؤ گے؟"

"پامپلونا" میں نے بارش سے بچاؤ کی خاطر شتر مُرغ کی مانند سر جیپ کی چھت کے نیچے کر لیا۔

"پام پام لونا؟" اس نے اپنی گھنی بھنویں چڑھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

میں نے پامپلونا کے ہجے کر کے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ایک منٹ۔ میں نقشہ دیکھ کر تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ پام پام......" اس نے جیپ کے پچھلے حصے میں سے ہسپانیہ کا ایک بوسیدہ نقشہ نکالا اور اپنے گھٹنوں پر پھیلا کر اس پر آنکھیں گھمانے لگا۔

"یہ سڑک پتہ نہیں کہاں جاتی ہے؟" خاصی دیر بعد اس نے نقشے پر پڑی ایک بھوری لکیر پر انگلی چلاتے ہوئے حیرت سے کہا اور پھر اُسی لحظہ منہ کھول کر ہنسنے لگا "ہا ہا سڑک نہیں یہ تو میری داڑھی کا ایک بال ہے ...... ہو ہو چھوٹا سا لطیفہ ہو گیا۔"

"اور یہ جو بڑا سا لطیفہ باہر کھڑا بارش میں بھیگ رہا ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے تنگ کر کہا۔

"اوہ سوری...... باہر تو بارش ہو رہی ہے۔ جلدی جیپ میں بیٹھ جاؤ باہر کیوں کھڑے ہو۔ میں تمہیں پام پام لونا میں اُتار دوں گا۔"

"بہت خوب" میں نے خوش ہو کر کہا اور جیپ کے اندر گھسنے لگا۔

"ایک منٹ" اس نے ہاتھ آگے کر دیا۔ "چرس تو نہیں پیتے؟"

"نہیں" میں نے سر جھٹک کر بے صبری سے کہا۔ میری کمر پر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

"پھر ٹھیک ہے" اس نے ہاتھ نیچے کر لیا۔ "اپنا سامان پچھلے حصے میں رکھ دو اور میرے برابر میں بیٹھ جاؤ۔"

جیپ کے پچھلے حصے پر لنڈے بازار کی کسی دکان کا گمان ہوتا تھا۔ لکڑی کے شہتیر، کھیتی باڑی کے اوزار، پٹرول کے جیری کین، فالتو ٹائر، کلہاڑے اور مختلف سائزوں کی لمبی لمبی چھریاں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اپنا سامان کا تھیلا درمیان میں رکھ کر اسے ایک پرانے کوٹ سے ڈھانپ دیا۔ اور پھر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیپ سٹارٹ کر دی۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ "میں تمہیں ایک بات تو بتانا ہی بھول گیا تھا۔" اس نے اپنی جھاڑی نما مونچھوں کو منہ کے آگے سے سمیٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پٹرول کی قیمت بانٹنا ہو گی۔"

"میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں بس پر سفر کیوں نہ کرتا؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"پھر مجبوری ہے۔" اس نے سٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر فیصلہ سنا دیا۔

پہلے تو جی میں آئی کہ ان مولانا کو بے نقط سنا کر فوراً جیپ سے اتر جاؤں۔ بھلا ہچ ہائکنگ میں بھی "مفت" نہ لگے تو اتنی خواری سے فائدہ؟ مگر پھر خیال آیا کہ بارش ابھی تک جاری ہے اگر شام تک کوئی اور لفٹ حاصل نہ کر سکا تو بے نیل و مرام واپس ہوسٹل تک پیدل ہی جانا پڑے گا۔

"مجھے منظور ہے۔"

میں جو پہلے دبکا بیٹھا تھا اب ٹانگیں پھیلا کر نشست پر نیم دراز ہو گیا اور

سگرٹ سلگا کر مزے سے کش لگانے لگا۔ اگر کوئی شخص ازراہِ نوازش لفٹ کی پیشکش کرے تو دورانِ سفر آپ کا رویہ اس بھلے آدمی کے ساتھ نہایت ہی عاجزانہ قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانا اور تمام سوالوں کا جواب انکساری سے دینا آپ پر فرض ٹھہرتا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ اگر مجھ پر پٹرول کی قیمت ادا کرنا واجب قرار دیا گیا تھا تو پھر دھڑلے سے سفر کرنا بھی میرا حق بنتا تھا۔

"جالی گڈ" بارلیش صاحب بے حد خوش ہوئے۔ "میرا نام ٹونی ہے۔ ویسے ایک سگرٹ تو پلاؤ۔"

"سگرٹوں کی قیمت بھی بانٹنا ہو گی۔ مجھے مستنصر کہتے ہیں۔" میں بھی کمینگی پر اتر آیا۔

"رائٹ یو آر اولڈ بوائے" اس نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور جیپ سٹارٹ کر دی۔

"آج سے صرف دس روز پہلے تک میں لندن میں ایک قصائی کی دکان پر ملازم تھا۔" اس نے میری ڈبیا سے سگرٹ نکال کر سلگا لیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "سارا دن ارجنٹائن کی گائیوں اور یارکشائر کے سوروں کی بوٹیاں کاٹتا اور شام کو کسی شراب خانے میں جو کی شراب چڑھانے کے بعد جھومتا ہوا اپنے کمرے میں جا کر سو رہتا۔ البتہ ہفتے کی شب کو میں رقص کرنے کے لیے چلا جایا کرتا۔ جس لڑکی کو بھی رقص کی دعوت دیتا وہ ناک چڑھا لیتی۔ دراصل یوڈی کولون کی پوری شیشی انڈیل لینے پر بھی میرے جسم میں سے گوشت کی بو آتی رہتی تھی۔ پچھلے ہفتے اخبار میں ایک اشتہار نظر آیا۔ روڈیشیا کی سفید فام حکومت کو مقامی آبادی کے مقابلے میں اپنا تناسب بڑھانے کی غرض سے سفید فام کاشتکاروں کی ضرورت تھی۔ مالی اعانت کے علاوہ دو سو ایکڑ زمین بلا معاوضہ دینے کا اعلان بھی تھا۔ میں نے سوچا افریقہ کی کھلی فضاؤں میں رہنے سے کم از کم میرے جسم میں رچی گوشت کی بو زائل ہو سکے گی چنانچہ جمع شدہ پونجی سے یہ پرانی جیپ خریدی اور کمرے کا

سامان بیچ کر کھیتی باڑی کے اوزار حاصل کر لیے۔ میڈرڈ سے جبل الطارق جاؤں گا اور وہاں سے سمندر پار افریقہ۔"

"یہ درجن بھر لمبی چھریاں کیا آدم خور وحشیوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے فٹ بازار کی دکان کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔ اُن تیز چھریوں کی موجودگی مجھے خاصی دیر سے پریشان کیے ہوئے تھی۔

"آدم خور وحشی؟ واٹ نان سینس! میں خود آدم خور ہوں بشرطیکہ آدم ...... صنفِ نازک کی صورت میں کھانے کو ملے۔ ہاہا!" اس نے منہ کھولا اور قہقہہ داغ دیا۔ "کیوں ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

میں نے سوچا چھوٹا سا لطیفہ تب ہو گا بیٹے جب تمہارے جھاڑ جھنکار سے ڈھکے چہرے کو دیکھ کر افریقی حبشی بھی بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوں گے کہ ایسا جانور نہ دیکھا نہ سنا!

"ہاں ہو گیا" میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔ "مگر وہ چھریاں!"

"ہاں وہ چھریاں! میں لندن بھر میں بہترین گوشت کاٹنے والا ہوں۔ ان چھریوں کے ساتھ میری رفاقت دس سال پرانی ہے۔ مجھے ان کے ساتھ کچھ جذباتی وابستگی سی ہے چنانچہ بقیہ سامان کے ساتھ انہیں بھی فروخت کر دینے کا حوصلہ نہ ہوا۔"

ہسپانوی کسٹم والے ان چھریوں کو دیکھ کر بے حد جز بز ہوئے۔ بہر حال جب میں نے انہیں ہنٹر بیف کا ایک ٹکڑا اس صفائی سے کاٹ کر دکھایا کہ اُس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا تو وہ قائل ہو گئے۔"

"اگر مقصد صرف گوشت کاٹنا ہے تو کیا ایک چھری سے کام نہیں چل سکتا؟" مجھے چھریوں کی تعداد کے بارے میں بھی تشویش تھی۔

"تم شاید گوشت کاٹنے کی شاندار تکنیک سے بالکل ناواقف ہو۔ جانور کی عمر، جسمانی صحت، کاٹے جانے والے گوشت کا مصرف اور موٹائی ایسے عوامل ہیں جنہیں

مدِ نظر رکھ کر ہی درجنوں چھریوں میں سے ایک چھری کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم سور کی ران ......"

اس نے گوشت کاٹنے کے جدید طریقے کچھ ایسی فصاحت و بلاغت سے بیان کیے کہ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وطن واپسی سے قبل یورپ سے چھریوں کا ایک نفیس سیٹ خریدوں گا اور اگلی بقر عید پر اپنے "بھیڈو" کے علاوہ یار دوستوں کے دنبوں پر بھی طبع آزمائی کروں گا۔

چند میل طے کرنے کے بعد ٹونی نے جیپ سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ میں موڑ دی۔

"سو پیسیتے" اس نے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلا دی "پٹرول ختم ہو گیا ہے۔"

"پچانوے پیسیتے" میں نے رقم اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "پانچ پیسیتے سگرٹ کے۔"

یہاں سے روانہ ہوئے تو بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرسبز اور دھند میں لپٹے ہوئے۔ باسک صوبے کا یہ حصہ کوہ پیرانیز کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے اکثر بارش میں بھیگا رہتا ہے۔ زمین انتہائی زرخیز ہے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر سیب کے درختوں کی قطاریں دُور تک چلی گئی تھیں۔ یکدم تیز اور خنک ہوا چلنے لگی اور آسمان پر چھائے ہوئے بادل اس تیزی سے بکھرے جیسے انہیں کُل خانٹ دیکھنے جانا ہو۔ تھوڑی دیر بعد مطلع مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا۔ وادی میں اُرمن اور مکئی کے ہرے بھرے کھیت دُھوپ میں چمکنے لگے۔ ہم بلند پہاڑوں میں سے گزر کر دوسری جانب نکل آئے۔ بائیں ہاتھ پر کارک کے درختوں کے ایک گھنے جنگل میں سفید رنگ کے مویشی چر رہے تھے۔ ان سے پرے ایک وسیع اور سرسبز چراگاہ تھی جس کے پہلو میں ایک سفید شیشہ ندی لیٹی ہوئی تھی۔

طلوسا کا قصبہ آیا تو ٹونی نے ایک دوکان سے باسک کسانوں کی روایتی ٹوپی خرید کر پہن لی۔ وہ اس ٹوپی میں کسی یہودی کی مانند لگ رہا تھا۔

طلوسا سے نکلے تو پیرانیز کا پورا سلسلۂ کوہ کچھ یوں نظر کے سامنے آیا جیسے ہوسپتال کے فٹ پاتھ پر بیٹھے کسی فوٹوگرافر کا منقش پردہ...... بلند پہاڑ، چمکتی ندیاں اور سرسبز درخت، ہمالیہ اور ایلپس کے بعد دنیا کا سب سے مشہور پہاڑی سلسلہ۔ انہی پیرانیز کو جنہیں عربی زبان میں برت کہتے ہیں عبدالرحمٰن الغافقی نے عبور کیا اور فرانس پر حملہ آور ہوا۔ ہینی بال اپنی فوج اور سینتیس ہاتھیوں سمیت ان پہاڑوں میں سے گذر کر روم کی جانب بڑھا۔ فرانس کے بادشاہ شارلیمان نے اندلس کے مسلمان سرداروں ابوالاسود، ابن حبیب اور عامل العربی کی شہ پر پیرانیز پار کئے اور سرقسطہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ سردار عبدالرحمٰن الداخل کے مخالفوں میں سے تھے۔ اس دوران میں جرمنوں نے فرانس پر حملہ کر دیا اور شارلیمان کو سرقسطہ کا محاصرہ اٹھانا پڑا۔ فرانس واپس جاتے ہوئے جب وہ پیرانیز کے بلند درہ رانسے وُو میں سے گزر رہا تھا تو شام کے دھندلکے میں ہزاروں باسک کسان اور مسلمان سپاہی گرد و نواح کی چٹانوں سے قہر بن کر ٹوٹ پڑے اور پوری فرانسیسی فوج کو تہ تیغ کر دیا۔ درہ رانسے وُو کی اس خون آشام شب نے رولینڈ کی کہاوت کو جنم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شارلیمان رانسے وُو سے گذرتے وقت اپنی فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ فوج کے عقب میں رولینڈ اور دوسرے فرانسیسی سردار چلے آ رہے تھے۔ مسلمان حملہ آور ہوئے تو رولینڈ نے اپنا بگل اتنی قوت سے بجایا کہ اس کے پھیپھڑے پھٹ گئے۔ بگل کی آواز پورے پیرانیز میں گونج گئی میلوں دور شارلیمان کو خطرے کا علم ہو گیا اور وہ جان بچا کر فرانس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان دنوں شاید فرانسیسیوں کے پھیپھڑے قدرے کمزور تھے کہ یک مرتبہ بگل پھونکنے سے پھٹ جاتے تھے ورنہ اس زمانے میں تو مشہور حبشی بگل نواز لوئی امسٹرانگ

نصف صدی سے زائد بگل بجانے کے بعد جب مرا تو دل کے عارضے سے نہ کہ پھیپھڑے پھٹنے سے۔ بہرحال درہ رانسے وُو میں فرانسیسیوں کو مکمل شکست ہوئی اور بجز چند افراد کے کسی نے فرانس کا منہ نہ دیکھا۔ شارلیمان اس شکست سے اتنا بددل ہوا کہ پھر کبھی اندلس کا رُخ نہ کیا بلکہ امیر اندلس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی بیٹی اس کے حرم میں دینے کی پیشکش بھی کر دی۔

اب پھر بارش شروع ہو گئی۔ ہمارے بائیں ہاتھ پر درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک چمکتا ہوا دریا نظر آیا اور غائب ہو گیا۔ جیپ کی رفتار تیز ہو گئی۔ ہم نشیب کی جانب جا رہے تھے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد یکلخت سڑک ہموار ہو گئی۔ ہم ایک وسیع میدان میں داخل ہو رہے تھے۔ سڑک کے دائیں ہاتھ پر ایک بلند چٹان آئی۔ چٹان کی چوٹی پر ایک بیل کا مجسمہ نصب تھا جس پر "پامپلونا" کے الفاظ تحریر تھے۔ کچھ اور آگے گئے تو اس عظیم میدان کے بیچ پامپلونا کا شہر نظر آنے لگا۔ کلیساؤں کے مینار اور گنبد بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ایک دم چاروں طرف کھڑے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اٹکی ہوئی گہری دھند میدان میں اُترنے لگی اور ہم اس کے نرغے میں آ گئے۔ ٹونی نے جیپ کی بتیاں جلا دیں۔

پامپلونا نوارا صوبے کا صدر مقام ہے۔ کوہ پیرانیز کے دامن میں دریائے آرگا کے کنارے آباد اس شہر کو روم کے سپہ سالار پومپی نے از سرِ نو تعمیر کیا اور اسے پومپیلو کا نام دیا۔ عرب اسے بنبلونا کہتے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن جب پورا ہسپانیہ زیر کرنے کے بعد اس شہر میں داخل ہوا تو ہر سُو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عیسائی امیر عبدالرحمٰن کی بے پناہ شجاعت سے خوف زدہ ہو کر شہر خالی کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہاں کے حبشی گورنر عثمان ابن ابی نسع نے اپنی بیوی جو کہ ڈیوک آف ایوڈس کی لڑکی تھی کے اکسانے پر علم بغاوت بلند کر دیا۔ امیر اندلس عبدالرحمٰن الغافقی نے شدی ابن زبان کو یہ بغاوت فرو کرنے پر مامور کیا۔ نسع نے شکست کھائی اور

ایک چٹان سے کود کر خودکشی کر لی۔

ہم پامپلونا کے مرکزی چوک میں ایک قہوہ خانے کے برآمدے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ڈلی ایک ننھے منے ہسپانوی لڑکے سے "لمپیا لوتاس" یعنی بوٹ پالش کروا رہا تھا اور میرے ذہن میں ارنسٹ ہیمنگوے کے ناول "فی اسٹا" کے لازوال کردار انگڑائیاں لے رہے تھے۔ شراب کی رسیا لیڈی بریٹ، اخبار نویس جیک، یہودی کوہن اور لیڈی بریٹ کا دلدادہ منگیتر مائک۔ وہ سب پامپلونا کے جشن سان فرمین میں شرکت کے لیے پیرس سے آئے تو اسی چوک میں واقع "ہوٹل مونتانا" میں ٹھہرے۔ جشن شروع ہونے سے ایک روز قبل نواحی علاقوں کے کسان فروخت شدہ فصل کی رقم سے مالا مال بسوں میں بیٹھ کر شہر میں آتے اور پھر اس کی تنگ گلیوں میں واقع شراب خانوں میں سما جاتے اور پھر جولائی کے پہلے ہفتے میں جشن سان فرمین پامپلونا کے غیر مؤثر شہر پر ایک دھماکے کی صورت میں وارد ہو جاتا۔ سات روز کے لیے دن اور رات کا تصور ختم ہو جاتا۔ شہر کے کوچہ و بازار میں رقص و موسیقی کی محفلیں برپا ہوتیں۔ شراب نوشی حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی۔ لوگوں کے شور و غوغا سے کان پھٹنے کو آتے۔ اسی جشن کے دوران میں لیڈی بریٹ ایک نوخیز بل فائٹر کے دامِ الفت میں گرفتار ہوتی ہیں۔ کہیں ...... شاید اسی قہوہ خانے میں ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

جشن کی سب سے بڑی خصوصیت "بھینسوں کی دوڑ" ہوتی ہے۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی شہر کے ٹاؤن ہال سے ایک راکٹ چھوٹتا ہے اور اس کے پھٹتے ہی شہر سے باہر واقع اصطبل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ چھ خونخوار بھینسے ڈکراتے ہوئے باہر نکلتے ہیں اور پامپلونا کی ایک مخصوص گلی میں دوڑنے لگتے ہیں۔ متعینہ راستے کے دونوں طرف لکڑی کی ایک باڑھ کھڑی کر دی جاتی ہے تاکہ بھینسے ادھر ادھر نہ نکل جائیں۔ یہ راستہ سیدھا بل رنگ کو جاتا ہے۔ اسی دوپہر کو یہی چھ بھینسے بل فائٹ

میں حصہ لیتے ہیں۔ راستے کے دونوں طرف لکڑی کی باڑھ کی آڑ میں اور مکانوں کی بالکونیوں میں کھڑے ہزاروں لوگ شور مچا مچا کر بھینسوں کو تیز بھاگنے پر اُکساتے ہیں۔ بھینسوں کے اصطبل سے باہر آتے ہی بے شمار ہسپانوی اور غیر ملکی اُن کے آگے آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں جونہی کسی بھینسے کا نوکیلا سینگ خطرناک حد تک جسم کے قریب پہنچتا ہے دوڑنے والا لکڑی کی باڑھ پھلانگ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے۔ بھینسوں کے آگے دوڑنے کے لیے صحت مند جسم کے علاوہ مضبوط اعصاب کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی عین وقت پر حواس کھو بیٹھے اور بھینسے کے نزدیک آتے ہی پھرتی سے لکڑی کی باڑھ نہ پھلانگ سکے تو اکثر اوقات جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

اس دیوانگی کا جواز بھی ہمیں بل فائٹنگ کی طرح ہسپانوی مزاج میں ملتا ہے۔ ہر آدمی تو بل فائٹر نہیں بن سکتا چنانچہ وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر بھینسوں کے آگے "دوڑ" لگاتا ہے اور اپنا شوق پورا کرتا ہے۔ اور تو اور کئی غیر ملکی بھی مردانگی کے اس مظاہرے میں حصہ لینے کے لیے سارا سال اُس لمحے کے انتظار میں رہتے ہیں جب وہ بھینسوں کے آگے سرپٹ بھاگ رہے ہوں گے اور اُن کے کانوں کے پردے پھاڑتے ہوئے خونخوار جانوروں کے سُموں کی دھمک سے لرز رہے ہوں گے۔ بھینسوں کے آگے دوڑنے کے لیے سفید قمیض، ٹینس شوز اور سُرخ رومال روایتی لباس ہے۔ ٹینس شوز تیز دوڑنے کے لیے اور سُرخ رومال بھینسے کو اشتعال دلانے کے لیے۔ سیاحت پر نکلنے سے پہلے پامپلونا کے جشن سان فرمین میں شرکت کرنا اور ہر روز اُن بھینسوں کے آگے دوڑنا میرے پروگرام میں شامل تھا، مگر بدقسمتی سے چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں وقت پر نہ پہنچ سکا۔

یہ ہنگامہ خیز جشن جس مقدس ہستی سینٹ سان فرمین کے نام پر رچایا جاتا ہے اُس بھلے آدمی کا صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے پامپلونا کے باشندوں کو عیسائی

بنانے کی غلطی کی تھی۔

پامپلونا کا مرکزی چوک جہاں جشن کے دوران میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اب تقریباً خالی پڑا تھا۔ قہوہ خانوں کے برآمدوں میں بچھی کرسیوں پر ویٹر گاہکوں کے انتظار میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں نے قہوہ خانے کے مالک سے اس بے رونقی کا سبب پوچھا تو وہ اُداس ہو کر کہنے لگا۔

"پامپلونا پورے سال میں جشن سان فرمین کے دوران میں صرف سات روز کے لیے آباد ہوتا ہے اور پھر ایسا اُجڑتا ہے کہ پورے ہسپانیہ میں اس سے ویران شہر نہیں ملتا۔ ویسے اس مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ پورے چھ آدمی بھینسوں کی دوڑ میں ہلاک ہوئے اور سب کے سب غیر ملکی۔"

وہ ناگزیر وجوہات جن کی بنا پر میں جشن سان فرمین میں شرکت نہ کر سکا تھا، مجھے یکدم بے حد عزیز ہو گئیں۔

"پام پام لونا میں رہ کر کیا کرو گے؟" ٹونی نے جواب تک "لمپیا پوتاس" کروا رہا تھا، سر اُٹھا کر کہا "میرے ساتھ میڈرڈ کیوں نہیں چلتے؟"

میں خود اس اُجڑے دیار میں شب بسر کرنے کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہ تھا مگر میڈرڈ تک پہنچتے پہنچتے یہ کمبخت جیپ تو ہزاروں پسیتوں کا پٹرول ہضم کر جائے گی میں نے سوچا۔

"ذاتی طور پر تو مجھے یہ شہر پسند ہے۔" میں نے دھڑکتے دل سے اپنا کیس مضبوط کرنے کی خاطر لاپروائی سے کہا۔ "لیکن اگر تم اصرار کرتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔"

"یو آر اے سپورٹ!" اُس نے اپنی ڈھلکی ہوئی نیکر انگلیوں میں اُڑس کر اوپر چڑھائی اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن ایک شرط ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں پٹرول کی نصف قیمت کی بجائے صرف تیسرا حصہ ادا کروں گا۔"

"منظور ہے" اُس نے داڑھی کھجا کر کہا "اب پلاؤ ایک سگرٹ ...... اور تم بھی سگرٹ کے پیسے پٹرول کی قیمت میں سے وضع نہیں کرو گے، ہو گیا نا ایک چھوٹا سا لطیفہ؟"

ہم شہر سے باہر نکلنے لگے تو ٹونی نے چمڑے کی ایک دکان کے سامنے جیپ روک لی اور دندناتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بغل میں ایک پچکا ہوا چمڑے کا مشکیزہ دبائے برآمد ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سڑک پار کر کے ایک غلیظ سے قہوہ خانے میں گھس گیا۔ وہاں سے باہر نکلا تو اس کے کاندھے پر دھرا مشکیزہ ایک جونک کی مانند پھول کر کپا ہو رہا تھا اور اس پر سُرخ شراب کے قطرے ہچکولے لے رہے تھے۔

"اسی پیسے میں یہ مشکیزہ اور اس میں بھری ہوئی سُرخ شراب" اس نے بڑے پیار سے مشکیزے کی نم آلود سطح پر ہاتھ پھیرا اور اُسے جیپ کے پچھلے حصے میں رکھ دیا۔ "ہسپانیہ میں شراب کی ارزانی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ رہوڈیشیا جانے کی بجائے یہیں رہ جاؤں۔" وہ بے حد مسرور نظر آ رہا تھا۔

پامپلونا سے نکلنے کے بعد کچھ دُور تک تو ہم اس پیالا نما وسیع اور سرسبز میدان میں سفر کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ ہرے بھرے کھیت چٹیل میدانوں میں بدلنے لگے اور چھوٹی پہاڑیاں خشک اور بلند پہاڑوں کی صورت اختیار کر گئیں کہیں کہیں پائن اور کارک کے درخت بھی نظر آتے۔ کوہ پیرانیز میں سرایت کردہ خنکی دھیرے دھیرے ہمارے جسموں میں سے زائل ہو رہی تھی اور اب قدرے گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اِدھر ٹونی کی جیپ بھی ہر تیس چالیس میل کے بعد پیاس سے نڈھال ہو کر کھڑی ہو جاتی اور اس میں گیلنوں پٹرول ڈلوانا پڑتا۔

دوپہر کے وقت ہم نے ایک چھوٹی سی ندی عبور کی۔ میں نے نقشے میں دیکھا دریائے ابرو تھا۔ رُومیوں سے قبل اس دریا کا نام آئبیرس تھا اور اس کے کنارے

بسنے والے لوگ آئیبرین کہلاتے تھے۔ہسپانیہ کا قدیم نام آئبیریا اسی دریا سے اخذ ہُوا۔
اس کے بعد قلعہ ہورا کے قصبے سے گذر ہُوا جہاں ہشام کے عہد میں بغاوت ہوئی۔
اس بغاوت کو ابن غالب نے فرو کیا۔

قلعہ ہورا سے نکلتے ہی خشک اور بلند پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ
شروع ہو گیا۔وحشت ناک اور بے آب و گیاہ۔دور دور تک آبادی کا نام و نشان
نہ تھا۔یہ قشتالیہ تھا۔

قشتالیہ کا مطلب ہے قلعہ۔اس صوبے کو قلعہ اس لیے کہا گیا کہ ہسپانویوں
کے بقول یہ سرزمین ایک حصار کی صورت میں مسلمانوں کی یلغار کو روکے رہی۔
فرڈیننڈ اور ازابیلا جنہوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کو
سرنگوں کیا قشتالیہ ہی کے فرمانروا تھے۔کہا جاتا ہے کہ ہسپانیہ کی عظمت قشتالیہ
کے باشندوں اور ذرائع کی مرہون منت تھی۔قشتالیہ رُو بہ زوال ہُوا تو ہسپانیہ
کی عظمت بھی گہنا گئی۔قشتالیہ کی موجودہ پسماندگی اور زبوں حالی کے بارے میں
ہسپانوی شاعر انتونیو مچادو لکھتا ہے۔

"بدبخت قشتالیہ

بیتے دنوں میں تو کتنا عظیم تھا

مگر اب

تو چیتھڑوں میں لپٹا ہُوا ہے۔"

بنجر پہاڑوں اور چٹیل میدانوں میں بگولے اُٹھ رہے تھے اور پاکستان کی چلچلاتی
گرمیوں ایسی لُو سے ہمارے چہرے جھلسے جا رہے تھے۔میں نے اپنی سفید برساتی
تو پامپلونا سے چلتے وقت ہی اُتار دی تھی مگر اب گرمی کی شدت سے قمیض کے
اندر میرے جسم پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے۔ٹونی کی تقلید کرتے
ہوئے میں نے بھی تمام کپڑے اتار کر ایک نیکر پہن لی۔

جس سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے وہ بے حد ناہموار تھی۔چھوٹے چھوٹے کنکر اور پتھر
ٹائروں کی زد میں آ کر گولی کی مانند نکلتے اور جیپ کے نچلے حصے پر تڑاخ تڑاخ
برسنے لگتے۔شاید یہ سڑک بھی ان دنوں کی یادگار تھی جب قاضی ولی محمد کا ادھر سے
گذر ہُوا تھا۔وہ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:"ہسپانیہ کی بعض سڑکیں تو اس قدر
خراب ہیں کہ لکھنؤ کی سڑکوں کو مات کرتی ہیں"۔جیپ کی ونڈ سکرین ہر چند منٹ بعد
گرد سے اَٹ جاتی اور ٹونی کو اسے اپنی ایک پرانی قمیض سے پونچھ کر صاف
کرنا پڑتا۔قلعہ ہورا سے ہم تقریباً چالیس میل دُور آ چکے تھے مگر اس دوران کسی آبادی
یا پٹرول پمپ وغیرہ کا نام و نشان تک نہ ملا اور نہ ہی اس سڑک پر اور کوئی کار
یا ٹرک دیکھنے میں آیا۔کبھی کبھار گردونواح کے خشک پہاڑوں میں کہیں کہیں دھول
اٹھتی نظر آتی۔یہ دھول ہماری نظروں سے اوجھل کسی گھاٹی میں بھیڑوں کے ریوڑ
کے چلنے سے اُٹھ رہی تھی۔ڈان کے خوتے نے بھی لامانچا کے میدانوں میں اسی
قسم کی دُھول اٹھتی دیکھی تو اس نے یہ تصور کر لیا کہ دشمن کی لاتعداد فوج اس کی
جانب بڑھ رہی ہے۔چنانچہ اس عمر رسیدہ خدائی فوجدار نے اپنے گھوڑے روزی نانتے
کو تھپکا اور نیزہ تان کر اس خیالی دشمن پر حملہ آور ہو گیا۔ویسے ڈان کے خوتے تو کیا
کوئی بھی شخص اگر اس بے آب و گیاہ ویرانے کی تپتی ہوئی دوپہروں میں ہوش و حواس کھو
بیٹھے تو بعید نہیں۔ٹونی بار بار جیپ روک کر مشکیزے سے سُرخ شراب کے
چند گھونٹ نگلتا اور پھر اپنی ڈاڑھی میں سے پسینہ نچوڑ کر جیپ چلانے لگتا۔
اس کی آنکھیں گرمی سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

چاند کی سطح جیسی اس وحشت ناک اور ویران سرزمین پر ہر طرف ہُو کا عالم
طاری تھا۔صرف جیپ کے انجن کی آواز اس ویرانے کے خوابیدہ سکوت کو باقاعدگی
سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ہسپانیہ کا نصف سے زائد رقبہ اسی قسم کے خشک پہاڑوں
اور دُھول سے اٹے ہوئے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔سوئٹزرلینڈ کے بعد ہسپانیہ یورپ

کا بلند ترین ملک ہے۔ یونانی جغرافیہ دان سٹرابو نے ہسپانیہ کے جغرافیائی خدوخال اور زمین کی رنگت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے دیوار پر کھنچی ایک بھینسے کی کھال سے تشبیہ دی تھی۔ کہیں کہیں زیتون کے گرد آلود باغ بھی نظر آجاتے۔ پژمردہ اور اداس۔ "زیتون" اور "باغ" ایسے خوشگوار الفاظ ذہن میں اُترتے ہی جو دلکش سماں بندھتا ہے وہ انتہائی گمراہ کن ثابت ہُوا۔ اس بدصورت جھاڑی نما پودے کو تو درخت کہنا بھی زیادتی ہے۔ ہمارا کیکر اس آسیب زدہ درخت سے کہیں خوشنما ہے کیکر کو زرد پھول بھی تو لگتے ہیں۔

مخالف سمت سے ایک ٹرک نمودار ہوا اور دُھول اُڑاتا ہُوا ہمارے پاس سے گذر گیا۔ یورپ کے کسی ملک میں پہلی مرتبہ ایسی بے کراں وسعتوں کا احساس ہوا جو صرف ایشیائی ملکوں کا خاصہ ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم قندھار سے ہرات جا رہے ہوں۔ ویران خلائی وسعتیں، دُھول، بگولے...... صرف کُوچی خانہ بدوشوں کے سیاہ خیموں کی کمی تھی۔ آخرکار ایک قصبے سے گذر ہُوا۔ یُوں لگتا تھا جیسے یہاں طاعون کی فضا پھیل چکی ہے اور یہاں کے باشندے گھر بار چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔ ہر سُو ویرانی برس رہی تھی۔ وحشت ناک اور ڈراؤنا جیسے انگمار برگمین کی کسی آسیب زدہ فلم کا اجڑا ہوا گاؤں۔ رُکنے کو جی نہ چاہا۔ میں پسینے میں شرابور اُونگھتا رہا اور ٹونی مشکیزے میں سے شراب کے گھونٹ بھرتا۔ اپنی ڈاڑھی کھجلاتا جیپ چلاتا رہا۔ ہم دونوں سر سے پاؤں تک دُھول میں اَٹے ہوئے تھے۔ ایک دم جیپ رُک گئی۔

"کیا ہُوا؟" میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"پٹرول ختم ہوگیا ہے۔" اس نے سٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر نہایت لاپروائی سے کہا۔

"میری تو سٹی گم ہوگئی۔ "اب کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ جیپ کے پچھلے حصے میں سے ایک جیری کین نکال لایا "میرے پاس پٹرول کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ویسے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی ضرورت افریقہ کی بجائے یورپ کے ایک ملک میں پڑ جائے گی۔"

میں نے پچاس پسیتے کا ایک نوٹ ٹونی کی طرف بڑھا دیا۔ "میرا حصّہ"

"رہنے دو" وہ ہنس کر کہنے لگا۔ "اگر آج شب تک زندہ و سلامت رہے تو میرا چمڑے کا مشکیزہ شراب سے بھروا دینا، تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ ہوگیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

جیپ پٹرول سے تر ہو کر سٹارٹ ہوئی تو پھر اُکتا دینے والا گرم سفر شروع ہوگیا۔ گرد اور گرما کا تو یہاں مناسب انتظام ہے۔ میں نے سوچا گلا و گورستان بھی دستیاب ہو جائے تو ملتان کے مزے لُوٹتے...... ہسپانیہ کے بارے میں میرے تصورات چکنا چُور ہو رہے تھے۔ اگر یہی الاندلس ہے تو اللہ معافی دے۔ یہ عرب کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔

لُو کے تھپیڑے، جیپ کی تپتی ہوئی نشست، گرد کی تہیں، ٹونی کی کمبل نما داڑھی، میرا ننگا جسم جھلس رہا تھا جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ حلق سُوکھنے لگا۔ مجھے شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ ٹونی تو اپنا حلق بچی کھچی شراب کے قطروں سے تر کر رہا تھا مگر مجھے تو ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس درکار تھا۔ صرف سادہ پانی کا ایک گلاس۔ اور یا پھر شاید کہیں آس پاس ہی کوئی راہٹ چل رہا ہو۔ جس کے "گھنٹے" کی متواتر ٹٹ ٹٹ کی سُریلی آواز وہاں تک میری راہبری کرے۔ شیشم کی تالیاں بجاتے پتّوں کے سائے میں چاچا حیدر چارپائی ڈالے حقّے کے کش لگا رہا ہو اور ساتھ ساتھ اپنی اپھیروں کی سی آواز میں راہٹ کے آگے جُتے بیلوں کو پیار سے ہنکار رہا ہو "اوئے تینوں کرہ کے کھا واں۔ آ دیئے مریں توں!" مجھے دُور سے پگڈنڈی پر آتے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا "اوئے بسم اللہ تُسیں آیا اے"

اور اپنی تہمد رکی پگڑی سر پر جماتے ہوئے بیلوں کی کوٹھڑی میں سے ایک پوٹلی نکال کر لے آئے...... اسی راہٹ کے پانی سے سینچے ہوئے جو کے ستو اور چچا حیدر کے کھردرے ہاتھوں سے چھیلے ہوئے گنے کی شکر، ستو اور شکر...... اور پھر کنوئیں کا خنک پانی...... ہاں ہاں۔ ایک پرانی کھٹارا کار جسے ایک بوڑھا پادری چلا رہا تھا ہارن دیتی ہمارے پاس سے گزر گئی۔ شاید گرمی کی شدت سے میرا دماغ چلتا جا رہا تھا ورنہ میں تو ضلع گجرات پاکستان کی بجائے ضلع قشتالیہ میں تھا یعنی اگر یہاں کوئی راہٹ ہو بھی تو وہاں چچا حیدر کی بجائے کوئی مونچھوں والا موٹا ہسپانوی سومبریرو ہیٹ پہنے بیلوں کو ہنکارنے کے لیے "اوئے مریں توں" کی بجائے "ہے تورو۔ ہے تورو" کی رٹ لگا رہا ہو گا اور جو کے ستو کی بجائے جو کا پانی یعنی شراب اٹھا لائے گا۔

سڑک کے بائیں ہاتھ پر گہرائی میں سفید رنگ کا ایک گھر نظر آیا۔ صحن میں زیتون کا ایک گرد آلود درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔

"ہے ٹونی!" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے مکان کی جانب اشارہ کیا۔ "جیپ کھڑی کرو شاید وہاں سے پانی مل سکے۔ مجھے بے حد پیاس لگی ہے۔"

"مشکل ہے۔" اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا "بہرحال کوشش کر دیکھو اگر مل گیا تو مشکیزہ بھی بھر لانا۔ جیپ کا انجن بھی گرم ہو رہا ہے۔"

میں نے خالی مشکیزہ اٹھایا اور جیپ سے باہر نکل آیا۔ تیز دھوپ میرے بدن کو چھید گئی۔ جیپ کے انجن کی آواز گرد و نواح کے خشک پہاڑوں میں گونج کر ایک ہولناک سا تاثر دے رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا کھڈ میں اترا اور مکان کے صحن میں چلا گیا۔ زیتون کے درخت کے ساتھ ایک کالی بکری بندھی ہوئی تھی جو مجھے دیکھتے ہی ممیانے لگی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور کالی چادر میں لپٹی ایک پستہ قد بڑھیا باہر نکل آئی تو اس کی شکل بے حد ڈراؤنی تھی جیسے "میکبتھ" کی

کوئی چڑیل ہو۔ جھریوں کے تانے بانے میں اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

"پانی...... آگوا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے ہتھیلی لبوں سے چھوتے ہوئے اپنا مدعا سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے افلاس زدہ بوڑھے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مومنتو!" اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور چادر سنبھالتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔

بکری اب ممیانے کی بجائے اپنے آگے پڑے زیتون کے پتوں پر منہ مارنے لگی۔ صحن میں تازہ قلعی کی مہک تھی تیز دھوپ کی وجہ سے سفید دیواروں پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا باہر آئی تو اس نے دونوں ہاتھوں میں دودھ سے لبالب ایک مٹی کا پیالہ تھام رکھا تھا۔

"پانی؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ال لیچے" اس نے پیالہ میرے آگے کر دیا۔

عام حالات میں بکری کے دودھ کے نام سے ہی مجھے ابکائی آجاتی ہے مگر شاید یہ ہسپانوی بکریاں ہمارے ہاں کی بکریوں سے زیادہ تہذیب یافتہ ہوتی ہیں۔ اس دودھ نے بے حد مزہ دیا یا پھر میں بھی ڈان کے خوتے کی مانند تصورات کی دنیا میں بستا تھا اور بکری کے دودھ کو ستو اور شکر کا شربت سمجھ کر پی گیا۔ دودھ ختم کر کے میں نے قیمت ادا کرنے کی نیت سے نیکر کی جیب سے دس پسیتے کا ایک نوٹ نکالا۔

"نادا۔ نادا!" بڑھیا نے انکار میں زور زور سے سر ہلایا۔

"گراسیا۔ گراسیا" میں نے بھی زور زور سے سر ہلایا اور نوٹ جیب میں ڈال کر واپس سڑک پر آ گیا۔

دھوپ میں چمکتی ہوئی گرد آلود سڑک حدِ نظر تک سیدھی چلی جا رہی تھی۔

بالکل خالی۔ ٹونی کی جیپ وہاں موجود نہ تھی۔ میرے ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطرے یکدم حجم میں بڑھے اور ٹپ ٹپ میری آنکھوں میں گرنے لگے۔ نمکین اور گرم! اب کیا ہوگا؟ مجھے یقین تھا کہ ٹونی میرے سامان سمیت وہاں سے چمپت ہو گیا ہے۔ عام طور پر میں اپنے دونوں کیمرے ہر وقت اٹھائے پھرتا تھا۔ پاسپورٹ اور پیسے بھی ہمیشہ جیب میں رہتے۔ مگر آج میں نے نیکر پہننے کے بعد پتلون جیپ کے پچھلے حصے میں پھینک دی تھی۔ پاسپورٹ اور پیسے اسی میں تھے۔ کیمرے بھی وہیں رکھے تھے۔ میرے سامنے ایک سنسان سڑک دھوپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ ارد گرد خشک اور بنجر پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہر سو ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ صرف گرم لو کی سائیں سائیں اور شاید میرے دل کے دھڑکنے کی آواز۔ دھک دھک..... اب کیا ہوگا؟ دھک! میں بدبخت قشتالیہ کی پتھریلی زمین پر آگ برساتے آسمان تلے بے یار و مددگار کھڑا تھا۔ میرا کل سرمایہ ایک نیکر، دس پیسیتے کا ایک نوٹ اور ایک خالی چمڑے کا مشکیزہ تھا۔ کیا قشتالیہ ہمیشہ مسلمانوں کے لیے منحوس ہی ثابت ہوگا؟ آس پاس کہیں سایہ بھی نہ تھا۔ ٹونی چھوٹے چھوٹے لطیفے کرتا میرے ساتھ ایک بہت بڑا لطیفہ کر گیا تھا۔ میرے ذہن میں بے حد خوفناک خیال آ رہے تھے۔ قشتالیہ اور چچا حیدر کے رابطے کے درمیان پڑتے ہوئے درجنوں ممالک کے کسٹم آفیسر مجھے آنکھیں دکھانے لگے۔ پاسپورٹ؟ پاسپورٹ؟ وہ سب چیخ رہے تھے۔ میں پیرس، وینس، استنبول اور تہران کے بازاروں میں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا "مجھے بھیک دو میرے ساتھ ایک بڑا سا لطیفہ ہو گیا ہے" میرا دماغ چکرانے لگا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد دور سڑک پر دھول اٹھی۔ شاید کوئی ٹرک آ رہا تھا۔ میں ہاتھ پھیلا کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ جیپ تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے شروع کر دوں۔ ہاں ہاں یہ ٹونی کی جیپ تھی۔ جونہی جیپ میرے پاس آکر رکی، میں جلدی سے اندر آکر بیٹھ گیا۔

"یہ تم ہاتھ پھیلا کر سڑک پر اس طرح کیوں کھڑے تھے؟ دور سے یوں لگتا تھا، جیسے اوتھیلو مکالمے بولنے کی تیاری کر رہا ہے" ٹونی نے ڈاڑھی کھجلا کر پوچھا۔

"میں لمبی داڑھی والے ذیوس دیوتا کا استقبال کر رہا تھا" میں نے اپنے بے پناہ غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہاں انتظار کرنا پڑا" اس نے معذرت کی "تم پانی کی تلاش میں گئے تو موٹر سائیکل پر سوار ایک کسان مجھے یہاں کھڑے دیکھ کر رک گیا۔ میں نے اس سے جیپ کے ریڈی ایٹر میں ڈالنے کے لئے پانی کے بارے میں پوچھا تو وہ مجھے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک پرانے قبرستان میں لے گیا جہاں مُوروں کے زمانے کا ایک کنواں تھا...... بس وہیں دیر ہو گئی" اس کی داڑھی میں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ جیپ میں پانی ڈالنے کے علاوہ شاید وہ خود بھی نہا کر آیا تھا۔

"مُوروں کے زمانے کا کنواں؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"سینکڑوں برس پیشتر اس علاقے پر بڑی بڑی پگڑیوں والے وحشی مُور حکمران تھے۔ انھوں نے مسافروں کی سہولت کے لیے تمام بڑی شاہراہوں کے کنارے ہر چند کوس کے فاصلے پر کاروان سرائیں اور کنوئیں بنوائے۔ مجھے اس پادری نے بتایا تھا"

"کنوئیں کا پانی ضرور ٹھنڈا ہوگا؟"

"ہاں! کائی اور پرانی اینٹوں کی ملی جلی باس سے مہکتا ہوا خنک پانی..... لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہے کہ کنوئیں کا پانی ٹھنڈا تھا؟" ٹونی نے حیرت سے پوچھا۔

اب میں اسے کیونکر بتاتا کہ یہ میرے چچا حیدر کا کنواں تھا۔

"اس قبرستان میں کنوئیں کے آس پاس کوئی فقیر وغیرہ بھی تھا؟" میں نے قدرے توقف کے بعد ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

"فقیر؟" اُس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "ہاں کنویں کے قریب پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص زیتون کے درخت تلے سو رہا تھا...... ہو سکتا ہے کوئی فقیر ہو...... لیکن......"

"چار تھجنے...... گرو۔ گرما۔ گدا و گورستان...... بس ہو گیا ملتان!" میں نے خوش ہو کر بچوں کی طرح تالی بجا دی۔

"مُلتان؟" ٹونی کے گھانس پھونس میں اس کا منہ کسی گہرے غار کی مانند حیرت سے کھل گیا "یہ ملتان کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا "اولڈ بوائے تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ مجھے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا "مجھے ایک چھوٹا سا لطیفہ ہو گیا ہے۔"

ٹونی نے سٹیئرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی داڑھی اتنے زور زور سے کھجلائی جیسے اُسے نوچ لینا چاہتا ہو اور پھر سر جھٹک کر جیپ سٹارٹ کر دی۔ وہ کن اکھیوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا "مُلتان" وہ ہر چند لمحوں کے بعد بڑبڑاتا اور پھر سر جھٹک دیتا۔

ہماری جیپ قشتالیہ کی وسیع سرزمین پر دھول اُڑاتی چلی جا رہی تھی۔ ٹونی ملتان والی بات چیت کی وجہ سے شاید مجھ سے ناراض ہو گیا تھا اور بے حد سنجیدگی سے جیپ چلانے میں مصروف تھا۔ سُورج کی تمازت مدھم پڑ چکی تھی۔ کرنوں کی سیسہ پگھلی سفیدی اب زردی مائل تھی۔ گرد میں لپٹی ہوئی لُو کی جگہ خوشگوار اور تیز ہوا نے لے لی تھی اور ہم دونوں تاحدِ نظر لیٹی ہوئی سڑک پر نظریں جمائے چپ چاپ بیٹھے تھے۔

ثوریا! ثوریا! ثوریا!

شام کے دُھندلکے میں ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے واقع ایک قدیم شہر کی عمارتوں کے دُھندلے نقوش اُبھرے۔ ندی کے پار بائیں طرف ایک ٹیلے پر کسی تاریخی قلعے کے کھنڈر دکھائی دے رہے تھے۔ ویران اور ہیبت ناک...... میں نے نقشہ کھول کر دیکھا۔ یہ ثوریا تھا۔

"آج شب یہیں بسر کر لی جائے" میں نے تجویز پیش کی۔ ٹونی نے داڑھی کھجلا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

پُل کی دوسری جانب قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک پادری سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ ہم نے جیپ روک لی اور اُس سے ثوریا کے یُوتھ ہوسٹل کا پتہ دریافت کیا۔ وہ کچھ دیر تو اپنے کالے چوغے کی گہری جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر ہلاتا رہا۔ پھر اپنی ٹوپی درست کی اور ہمیں وہیں کھڑے رہنے کا اشارہ کر کے قلعے کے پہلو میں واقع ایک عمارت کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہمراہ گارڈیا سول کے دو گھڑ سوار بھی تھے۔ گارڈیا سول...... جن کے چمکتے ہوئے نُل بوٹ اور ترچھی ٹوپیاں ہسپانوی دیہاتیوں کے لیے وحشت اور خوف کی علامتیں بن گئے ہیں۔ ۱۸۴۴ء میں مقامی ملیشیا کی جگہ ان گارڈیا سول کا قیام زیرِ عمل لایا گیا۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں انھوں نے جنرل فرانکو کا ساتھ دیا۔ کہا جاتا ہے ان دنوں دیہاتیوں نے انتقاماً گارڈیا سول کو بڑی بیدردی سے قتل کیا۔ آج بھی ہسپانیہ

کے دیہات میں انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بے پناہ قانونی اور غیر قانونی اختیارات کے مالک ہیں۔ اُن کا ایک اشارہ کسی غریب کسان کی عمر بھر پابندِ سلاسل رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ہسپانیہ کے کسی کونے میں چلے جائیے گارڈیا سول وہاں موجود ہوں گے۔ سائیکل پر، پیدل یا گھڑ سوار، اور ہمیشہ جوڑوں میں۔ دو سے کم سفر نہیں کرتے۔ گارڈیا سول موجودہ حکومت کی بساط پر ایسے مُہرے ہیں جن کی مدد سے عوام کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کو "چیک" کیا جاتا ہے اور اب پادری اپنا لمبا چوغا سنبھالتا ہُوا دو گھڑ سواروں کے آگے آگے تیز تیز چلتا ہُوا ہماری جانب آ رہا تھا۔ ہسپانوی سوسائٹی کو استحکام بخشنے والے دو نگہبان...... پادری اور گارڈیا سول۔ جیپ کے قریب آ کر انھوں نے لگامیں کھینچ لیں۔ جیپ کے اندر بیٹھے ہوئے مجھے صرف گھوڑوں کی تھوتھنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں باہر آ گیا۔

"سینیور ہم ثوریا میں رات بسر کرنا چاہتے ہیں" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "کیا آپ ہمیں یہاں کے یوتھ ہوسٹل کا پتہ بتا سکتے ہیں؟"

"قومیت؟" گارڈیا سول نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کرختگی سے پوچھا۔

"پاکستانی" میں نے فوراً جواب دیا۔

"انگریز" ٹونی نے اپنی بارِش تھوتھنی جیب سے باہر نکال کر کہا۔

"منزل؟" دوسرے گارڈیا سول نے اپنے گھوڑے کو تھپکتے ہوئے دریافت کیا۔

"رہوڈیشیا" ٹونی نے بتایا۔

"سپین، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا......" میں نے ساتھ ساتھ انگلیوں پر گنتی شروع کر دی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے......" گارڈیا سول نے بے صبری سے

کہا "مرکزی چوک، دو سڑکیں، دائیں ہاتھ کی سڑک پر تیسری گلی نمبر ۳۲۔"

اس دوران میں اس کا ساتھی گھوڑے سے اتر کر جیپ کا جائزہ لیتا رہا، اور بڑے اہتمام سے اپنی ڈائری پر کچھ لکھتا رہا۔ اُس نے جیپ کے پچھلے حصے میں جھانکا مگر خوش قسمتی سے اُسے ٹونی کی چھریاں دکھائی نہ دیں ورنہ مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ گارڈیا سول کو ہسپانیہ میں داخل ہونے والے ہر غیر ملکی کے نام پتے اور رُوٹ کا علم ہوتا ہے۔

جب ہم گارڈیا سول کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے تو وہاں کسی روایتی یوتھ ہوسٹل کی عامیانہ عمارت کی بجائے ایک نہایت جدید طرز کی پانچ منزلہ بلڈنگ کھڑی تھی۔ میں جیپ سے اُترا اور شیشے کے بڑے دروازے کے ساتھ ناک چپکا کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ مکمل تاریکی...... میں نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھُل گیا۔ عمارت کا وسیع ہال بھائیں بھائیں کر رہا تھا کاؤنٹر بھی خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں جلدی سے باہر آ گیا۔

"ٹونی میرا خیال ہے کہ ہم غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ عمارت تو بالکل ویران پڑی ہے۔ ویسے بھی اتنی جدید اور وسیع عمارت یوتھ ہوسٹل نہیں ہو سکتی۔"

"نمبر ۳۲ تو یہی ہے" ٹونی جیپ سے اُترتے ہوئے بولا "چلو ایک مرتبہ پھر دیکھ لیتے ہیں۔"

"کوئی ہے؟" میں نے اندر داخل ہوتے ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا میری آواز سے پوری عمارت گونج اُٹھی "ہے ہے ہے ہے۔"

"ہُو ہُو ہُو" ٹونی کاؤنٹر کے ساتھ دوسری منزل کو جاتی ہوئی سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر یونہی ہُو ہُو کرنے لگا۔

"مجھے تو یہ عمارت آسیب زدہ لگتی ہے" میں نے ہال میں رکھے آرام دہ صوفے پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اتنی جدید عمارت آسیب زدہ نہیں ہو سکتی" ٹونی فرش پر بچھے نرم قالین پر لیٹ گیا۔ "ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

"مُو لشان" میں نے اُسے چھیڑا۔ وہ ہُو ہُو کرنے لگا۔

"باہر کا دروازہ کھلا ہے۔ فرنیچر بھی موجود ہے ...... لیکن ...... لیکن ......" میں ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کہیں دُور قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ بے حد مدھم گرتے ہوئے قدموں کی چاپ۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ٹونی نے فوراً ہُو ہُو بند کر دی اور وہ بھی کُھلا کر قالین سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے کان قدموں کی چاپ پر لگے تھے اور آنکھیں کاؤنٹر کے ساتھ والی سیڑھیوں پر کیونکہ آواز اُدھر سے ہی آ رہی تھی۔ خاصی دیر بعد سیڑھیوں پر ایک ٹھگنا سا بوڑھا نمودار ہوا۔ اُس کی جھکی ہوئی کمر کے گرد بندھی ہوئی بیلٹ کے ساتھ چابیوں کا ایک وزنی گُچھا لٹک رہا تھا۔ شاید وہ اس عمارت کا رکھوالا تھا۔

"سینیور!" ٹونی نے ہکلاتے ہوئے کہا "ہم غلطی سے یہاں آ گئے ہیں ہم تو یوتھ ہوسٹل ......"

"مومنتو" بڑھے نے ہم دونوں کی دھول میں اٹی ہوئی صورتوں اور میلی جیکٹ بیگوں پر ایک نگاہ ڈالی اور بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

مومنتو یعنی ایک لمحہ خاصا طویل ثابت ہوا۔ آخر کار صدر دروازہ کھلا۔ پہلے وہ چابیوں والا بڑھا داخل ہوا اور اس کے پیچھے ایک پستہ قد غلافی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی ٹھمکتی چلی آئی۔ ٹونی کی تو باچھیں کھل گئیں۔

"ہیلو" اس نے اپنا ہاتھ نیکر کے ساتھ رگڑ کر صاف کیا اور مصافحہ کرنے کی خاطر آگے بڑھایا۔

"سینیور؟" لڑکی نے ٹونی کا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف

سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تورنتیکو۔ یوتھ ہوسٹل" میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ درست جگہ پر آئے ہیں" اس نے بغل میں سے ایک رجسٹر نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا اور نہایت شستہ انگریزی میں ہم سے مخاطب ہوئی "آپ کے کارڈز؟"

"اوہ کارڈز؟" ہم دونوں نے کورس میں جواب دیا ہمارے کارڈ بقیہ سامان کے ساتھ جیپ میں رکھے تھے۔

"مومنتو" میں نے لڑکی سے کہا۔

"مومنتو" ٹونی تو کمر تک جھک گیا۔

ہم دونوں باہر آئے تو ٹونی کہنے لگا "ذرا مجھے سونگھنا"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"بس ذرا سونگھ کر بتانا کہ کیا اب بھی میرے جسم سے گوشت کی بُو آتی ہے جو اس لڑکی نے میرے ساتھ ہاتھ ملانے سے گریز کیا ہے؟"

"کم از کم گوشت کی بُو تو نہیں آتی" میں نے ہنس کر کہا "ویسے ہسپانیہ میں مردوں سے ہاتھ ملانے کا رواج نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے پھر کوشش کی جائے" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"کوشش کرنے سے پیشتر کسی آئینے میں صورت دیکھ لینا۔ اس بے ہنگم داڑھی میں بالکل چھوٹے سے لطیفے لگتے ہو۔"

"مُو لشان" ٹونی نے دانت نکال دیئے۔

کارڈ تلاش کر کے ہم بھاگم بھاگ واپس ہال میں پہنچے۔ بوڑھا چوکیدار ہال کے مختلف کونوں میں رکھے لیمپ جلا رہا تھا اور لڑکی سر جھکائے رجسٹر پر کچھ لکھ رہی تھی۔

"کارڈز" ہم دونوں نے اپنے یوتھ ہوسٹل کارڈ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے رجسٹر پر اندراج کر کے کارڈوں پر مہر لگائی اور گردن ٹیڑھی کر کے کہنے

گی۔ تیسری منزل پر کسی بھی کمرے میں سو جائیے۔"

"اور آپ؟" ٹونی نے کمال محبت سے دریافت کیا۔

"میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔" لڑکی نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ٹونی کا چہرہ لٹک گیا۔

"کیا اس ...... یوتھ ہوسٹل میں ہمارے علاوہ کوئی اور سیاح مقیم نہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل یہ عمارت حال میں ہی طلبہ کے طالب علموں کی رہائش کے لیے تعمیر کی گئی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں جب طالب علم اپنے آبائی شہروں اور قصبوں کو لوٹ جاتے ہیں تو اسے سیاحوں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی ثوریا جیسے دور افتادہ شہر میں کبھی کبھار ہی کسی سیاح کا گذر ہوتا ہے ——— ایک مرتبہ تو کمال ہو گیا ......"

"آپ کے بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔" ٹونی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"اور خاوند بھی۔" لڑکی نے شرارت سے کہا۔ "بہر حال آپ صبح اپنے کارڈ کارلوس سے وصول کر لیجیے گا میں نہ آسکوں گی۔ شب بخیر۔"

اس نے رجسٹر بغل میں دابا اور دروازہ کھول کر اسی طرح ٹھمکتی ہوئی باہر نکل گئی۔ بوڑھا کارلوس وہیں ایک صوفے پر بیٹھ کر سگرٹ پینے لگا۔ ہم دونوں باہر آئے۔ جیپ میں سے ضروری سامان نکالا اور پھر اسے پورچ میں کھڑا کر کے تیسری منزل پر چلے آئے۔ یہاں درجنوں کمروں میں سے ایک اپنی شب بسری کے لیے منتخب کیا اور اپنے سلیپنگ بیگ کھول کر بستروں پر بچھا دیئے۔ ٹونی عمارت کا تفصیلی جائزہ لینے کی خاطر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آج صرف ایک دن میں میں نے ہسپانیہ کے کتنے روپ دیکھ ڈالے۔ صبح میں سان سباستیان میں تھا۔ بارش اور دھند۔ پھر

بلند پیرانیز آئے۔ ہری بھری وادیاں۔ چمکیلے دریا اور برف پوش چوٹیاں۔ اس کے بعد قشتالیہ کی صحرائی وسعتوں میں سے گذر ہوا۔ گرد آلود سناٹے اور بیابانی ——— اور اب ثوریا۔

"ہُرّے" ایک دم پوری عمارت میں ٹونی کے ڈکرانے کی آواز گونج گئی۔ "ہُرّے، ہُرّے" وہ بے تحاشا چیخ رہا تھا۔

میں کمرے سے باہر آیا اور تیزی سے چلتا ہوا راہداری کے آخر تک آ گیا جہاں سیڑھیوں کے پاس ٹونی حلق پھاڑ پھاڑ کر "ہُرّے ہُرّے" کے نعرے لگا رہا تھا۔

"ارے او ہپ ہپ ہُرّے کے بچے" میں نے غصے سے کہا۔ "خدا کے لیے اس ویران عمارت میں یوں نہ چیخو۔ مجھے پہلے ہی خوف آ رہا ہے ...... پیٹ میں درد ہے کیا؟"

"ارے موٹے خان دیکھو تو سہی" اس نے میرے کندھے پر زور سے دھپ لگائی اور ہاتھ پکڑ کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ یہ ایک اجتماعی غسل خانہ تھا۔ نہانے کے شاور دو چار نہیں۔ درجنوں! گرم پانی۔ ٹھنڈا پانی۔ گرم ......" وہ غسل خانے کے ایک سرے سے شروع ہوا اور گرم پانی، ٹھنڈا پانی کی گردان کرتا ہوا شاور کھولتا چلا گیا۔ گرم پانی سے اٹھنے والی بھاپ نے پورے غسل خانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"ہُرّے" میں نے بھی نعرہ لگایا اور گرم پانی کی اس بارش سے لطف اندوز ہونے کی خاطر میدان میں کود پڑا۔ ایک گرد آلود اور گرم دن کی طویل مسافت کے اختتام پر اتنے وسیع پیمانے پر غسل ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کسی طور کم نہ تھا۔ ہم خاصی دیر تک ننھے بچوں کی مانند شور مچاتے ہاؤ ہو کرتے وہاں نہاتے رہے۔

اس غسلِ شاہانہ سے فارغ ہو کر ہم واپس کمرے میں آ گئے۔ قشتالیہ کی دھول اور گرمی سے نجات پانے کے بعد اب میں بے حد ترو تازہ اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ٹونی نے ایک بیگ میں سے بیف کا ایک چھوٹا موٹا پہاڑ برآمد کیا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک انتہائی باریک

ٹکڑا کاٹا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے گوشت کا ٹکڑا ایک کونے سے پکڑ کر اپنی ناک کے آگے لہرایا۔ اس میں سے ٹورنٹین مارکیٹ میں واقع بڑے گوشت کی دکانوں میں سے آنے والی ناگوار بُو بدرجہ اُتم اُٹھ رہی تھی۔ قشتالیہ کا گرم موسم اس پر پوری طرح اثر انداز ہو چکا تھا۔

"ٹونی ڈیئر...... یہ ہنٹر بیف افریقہ جا کر کسی مگرمچھ کو کھلا دینا۔ اس میں سے بُو آ رہی ہے۔"

"بُو؟" اس نے گوشت کو اک عالمِ وارفتگی میں ایسے سونگھا جیسے وہ سڑے ہوئے بیف کے ٹکڑے کی بجائے "رُباعیاتِ" نامی حسینہ کا گلاب ہو اور پھر لوڑا منہ کھول کر اپنے دانت اُس میں گاڑھ دیے۔ "مجھے تو نہیں آ رہی۔" اس کے جبڑے انجن کے پسٹن کی مانند تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

"آ بھی نہیں سکتی۔" میں نے ناک سکیڑ کر کہا۔ "بہر حال میں تو شہر جا کر صاف ستھری اور بھر پور قسم کی خوراک کھانے کے مُوڈ میں ہوں۔"

تین چار پاؤنڈ ہنٹر بیف نگلنے کے بعد ٹونی نے ایک مرتبہ پھر "ہُرّے" کا نعرہ بلند کر دیا۔

"اب کیا ہُوا ہے؟" میں نے کپڑے بدلتے ہوئے دریافت کیا۔

"آ رہی ہے۔" باقی ماندہ گوشت پر ناک جماتے ہوئے اُس نے فیصلہ دے دیا۔ "میں بھی تمہارے ہمراہ شہر جاؤں گا۔" اور پھر بڑی احتیاط سے بقیہ بیف کو اپنے بیگ میں واپس رکھ لیا۔

"اور یہ گوشت کس سلسلے میں محفوظ کیا جا رہا ہے؟"

"افریقہ کے مگرمچھوں کے لیے......" اُس نے منہ کھول کر ایک زوردار قہقہہ داغ دیا۔ "ہو گیا نا ایک چھوٹا سا لطیفہ؟"

"ہو گیا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کم از کم باہر جانے سے پیشتر کوئی مناسب قسم کا لباس تو پہن لو۔"

ٹونی نے میری اس درخواست پر اپنی براؤن نیکر کے ساتھ ایک بوسیدہ سی کالی بنیان بھی پہن لی۔ سر کے بالوں اور داڑھی کو انگلیوں سے سنوارا اور اُٹھ کھڑا ہُوا "خوش پوشاکی ہمیشہ سے میری شخصیت کا ایک لازمی جزو رہی ہے۔" اُس نے اپنی بنیان کے ایک سُوراخ میں انگلی چلاتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اعلان کیا۔

میں نے ٹونی کی خوش پوشاکی سے متاثر ہو کر اُسے اُس حبشی کے بارے میں بتایا جو لنڈن کی کسی گلی میں ننگ دھڑنگ گھوم رہا تھا۔ ایک انگریز بڑھیا نے اسے اس حالت میں دیکھا تو ڈانٹ کر کہنے لگی "نوجوان لڑکے تمہیں شرم آنی چاہیے جاؤ کوئی مناسب قسم کا لباس زیبِ تن کر کے آؤ۔" حبشی نے نہایت برخورداری سے سر ہلایا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس نے اپنے گلے میں ایک نہایت نفیس قسم کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ صرف ٹائی......!

ٹونی بدستور اپنی بنیان کے سوراخ میں بڑی سنجیدگی سے انگلی گھماتا رہا اور پھر شراب کا خالی مشکیزہ بغل میں داب کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُسے شاید میرا چھوٹا سا لطیفہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

ثوریا! ـــــ دو پہاڑوں کے درمیان اور نیلے آسمان تلے پھیلا ہُوا ایک سوتا جاگتا شہر جو اپنے گردونواح کے جغرافیائی خدوخال میں کچھ ایسے رچ بس گیا ہے جیسے اِس کے سُرخ چھتوں والے مکان، تنگ گلیاں اور بازار انسانی ہاتھوں کے تعمیر کردہ نہیں بلکہ زمین میں سے خود بخود اُگ آئے ہیں۔ پھوٹ پڑے ہیں! دریائے دویرو اسے ایک کمان کی مانند آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ ثوریا "سان جوآن دے دارو" کی مشہور خانقاہ کے پہلو میں سے شروع ہوتا ہے اور پھر پاپلر اور سیاہ اوک کے جھنڈوں میں سے جھانکتا دریائے دویرہ کو عبور کر کے قدیم قلعے کے گرد تنگ و تاریک گلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس شہر

کی خوبصورتی نے اشبیلیہ کے حُسن پرست شاعر انتونیو مچادو کو بھی اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ مچادو نے قشتالیہ کے صوبے کو بدبخت کہا، مگر اسی صوبے کے ایک شہر نے اُسے اپنے حُسن میں ڈبو کر اس بدبختی کو خوبصورتی میں بدل دیا۔ وہ لکھتا ہے :

"خوبصورت اور پاکیزہ ثوریا۔ بنفشی پہاڑیوں کے درمیان
میں آج ایک مرتبہ پھر
تیری فصیل کے پہلو میں دریائے ددرہ کے کنارے
پاپلر کے سنہری درخت دیکھ رہا ہوں۔
ثوریا سحر زدہ
ثوریا تسخیر کر لینے والا"

دریائے ددرہ کے کنارے پاپلر کے درختوں کے درمیان لیٹی ہوئی پُرسکون سڑک مچادو کی پسندیدہ سیرگاہ تھی۔ آج شام جب ہم ثوریا میں داخل ہوئے تو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ چھوٹی سی ندی جسے ہم نے عبور کیا تھا تاریخی دریائے دویرو تھا۔ ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند اربیان کی پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے پائن اور زیچ کے جنگلوں میں سے جنم لے کر یہ دریا ثوریا کو آ چھوتا ہے اور پھر بڑی خاموشی سے پورے ہسپانیہ کے سینے پر بہتا ہوا پرتگال میں داخل ہو جاتا ہے۔ ثوریا بھی ایک زمانے میں ہسپانیہ کے دوسرے تمام شہروں کی طرح مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ ہسپانوی تاریخ دان روایتی تعصب کی بنا پر ہمیں تو یہ بتاتے ہیں کہ یہ شہر اراگان کے بادشاہ الفانسو نے مسلمانوں سے دوبارہ حاصل کیا مگر مسلمان یہاں کب قابض ہوئے اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ مجھے خود ثوریا میں اسلامی دَور کے بارے میں کسی اسلامی تاریخ میں کوئی قابلِ ذکر حوالہ نظر نہیں آیا۔

یُوتھ ہوسٹل سے باہر نکل کر ٹونی اور میں "الامیڈا ڈی سروانتس" کے ہرے بھرے

پارک کے پہلو میں سے نکلتی ہوئی ایک سڑک پاسیو سان فرانسسکو پر ہو لیے۔

ثوریا نیون اشتہاروں کی تیز روشنیوں، ٹریفک کے بے پناہ شور اور جدید زندگی کی دوسری قباحتوں سے پاک قشتالیہ کے بے آب و گیاہ پہاڑوں میں گم ایک خاموش مگر پُروقار بستی ہے۔ زندگی سے بھرپور۔ مگر زندگی کی یہ لہر سطحی ہونے کی بجائے اس شہر کے قدیم در و دیوار اور اس کے باسیوں کے اندر چپکے چپکے اُبلتی رہتی ہے۔

ٹونی شاید ابھی تک مجھ سے ناراض تھا۔ وہ نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے "جب آئرش آنکھیں مسکراتی ہیں" گنگناتا چلا جا رہا تھا۔ مرکزی چوک عبور کر کے ہم کالے مے کلاڈو کی چوڑی سڑک پر آ گئے جو نسبتاً پُررونق تھی۔ ہم ایک قہوہ خانے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ٹونی اس کے باہر دیوار پر لگا ایک بُل فائٹ کا اشتہار دیکھ کر رُک گیا۔

"ہُوں" اس نے میری طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں اور پھر اشتہار پر چھپی بُل کی تصویر سے مخاطب ہو کر نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "نوجوان بُل تمہیں شرم آنی چاہیے۔ جاؤ کوئی مناسب قسم کا لباس زیبِ تن کر کے آؤ" اس کے ساتھ ہی اس کے وسیع و عریض ڈیل ڈول میں سے ایک زوردار قہقہہ برآمد ہو گیا۔ قہوہ خانے کے باہر بیٹھے ہوئے چند بوڑھے ہماری جانب بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

"اور ذرا تصور کرو اگر یہ بُل ایک نفیس قسم کی ٹائی باندھ کر آ جائے تو، صرف ٹائی......" وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہا تھا۔

"ٹونی!" میں نے بزرگوں کی مانند ڈانٹا۔

"سوری" اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک مرتبہ پھر "جب آئرش آنکھیں......" گنگناتا ہوا چلنے لگا جساب

برابر ہو چکا تھا۔

کالے ڈے کلاڈو کے دونوں طرف ثوریا کے باسی قہوہ خانوں کے باہر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر بیٹھے رات کے کھانے سے پیشتر مختلف مشروبات سے مسوڑھے گرم کر رہے تھے۔ اٹلی اور فرانس کی طرح ہسپانیہ میں بھی رات کا کھانا گھر کی بجائے باہر قہوہ خانوں میں کھانے کا رواج عام ہے۔ کھانے کے اوقات دس بجے سے شروع ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے اگر کسی قہوہ خانے میں جا کر کھانے کے بارے میں دریافت کریں تو آپ کو خبطی سمجھا جائے گا۔ رات کے اس پہر سڑک پر ٹریفک بالکل بند تھی۔ چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سڑک پہ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ فٹ پاتھ کا جو حصہ قہوہ خانوں کی کرسیوں سے خالی تھا وہاں نیچے بین ہیتیوں والی سائیکلوں پر سوار ویٹر حضرات کی "تانگوں" کو نشانۂ مشق بنا رہے تھے۔ ہم پاس سے گزرتے تو وہ بطورِ خاص ٹونی کو دیکھ کر بے حد محظوظ ہوتے اور گھنٹیاں بجاتے۔ ایک پُرہجوم قہوہ خانے کے باہر دو موٹی تازی فراخ دہن دوشیزائیں ٹونی کو دیکھتے ہی نہایت بھدے طریقے سے ہنسنے لگیں۔ اُس کا بھاری تن و توش وہیں جامد ہو گیا۔ "بس یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"یہاں شور بہت ہے۔ کسی پُرسکون جگہ بیٹھا جائے۔" میں نے رُکے بغیر جواب دیا۔

"مُوشان" ٹونی نے جھنجھلا کر کہا اور پھر چلنے لگا۔

"خاسمین۔ خاسمین۔" ایک بوڑھی عورت گلی کے نکڑ پر کھڑی چنبیلی کے پھول بیچ رہی تھی۔ ہسپانیہ کی اکثر عمر رسیدہ عورتوں کی مانند اس نے سر کو ایک کالے رُومال سے ڈھانپ رکھا تھا اور گھٹنوں تک لمبے سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے بڑی مشکل سے جھک کر آگے رکھی ٹوکری میں سے چنبیلی کا ایک گجرا اُٹھایا اور میری جانب بڑھا دیا۔ "خاسمین سنیور؟" اس کی پوپلی

مسکراہٹ میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔

"گراسیا!" میں نے پانچ پسیتے کا ایک نوٹ جیب میں سے نکال کر بڑھیا کے رعشہ زدہ ہاتھوں میں تھما دیا۔ ہسپانوی چنبیلی کے ان پھولوں میں ایک جانی پہچانی مہک تھی۔ گرم اور مشرقی!

ہم نے گلی کے اندر جھانکا۔ نیم تاریک اور بے حد تنگ! دونوں طرف بنے ہوئے مکانوں کے چھجے ایک دوسرے کو چھُو رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر لوہے کی سلاخ سے ایک زنگ آلود بورڈ لٹک رہا تھا۔ "ال گریکو" ہم دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

یہ ایک قدیم طرز کا انتہائی پُرسکون اور دیدہ زیب شراب خانہ تھا۔ کثرتِ استعمال سے اگرچہ قرطبہ کے چمڑے سے بنے ہوئے صوفوں کا رنگ ماند پڑ چکا تھا مگر ان میں ایک کلاسیکی قسم کی جاذبیت بدستور قائم تھی۔ دیواروں کا پلستر سیاہی مائل تھا۔ بلند چھت کے سیاہ شہتیروں میں لوہے کے بڑے بڑے کنڈے پیوست تھے جن کے ساتھ سالم جانوروں کے دھڑ لٹک رہے تھے۔ مشرقی گرم مسالوں سے محفوظ کردہ سُوکھا ہُوا گوشت۔ سُور معہ اپنی کریہہ النظر لمبی تھوتھنیوں کے پورے بکرے۔ گائے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ ان جانوروں کے گوشت کا رنگ شراب خانے کی بقیہ آرائش کی مانند سیاہی مائل تھا۔ چھت کی جانب دیکھنے سے کچھ اس قسم کا تاثر اُبھرتا تھا جیسے مردہ جانوروں کا یہ ریوڑ آپ پر حملہ آور ہونے کو ہے۔ جانے انہیں کتنے برس پیشتر سکھا کر یہاں لٹکایا گیا تھا۔ جب کبھی کوئی گاہک فرمائش کرتا تو شراب خانے کا پستہ قد مالک ایک سیڑھی شہتیر کے ساتھ لگا کر چھُری سے پسندیدہ جانور کے جسم کا مطلوبہ حصہ کاٹ کر لے آتا۔ یہ گوشت سلاد اور ڈبل روٹی کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ کاؤنٹر کے عقب میں شیلف پر لکڑی کے درجنوں ڈرم دھرے تھے جن پر ہسپانیہ کے مختلف

صوبوں میں کشید کی جانے والی انگور کی شرابوں کے نام کندہ تھے۔ کاتالونیا صوبے کی لاسالو۔ آراگان کی بوریا۔ گیلیسیا کی ربیرو۔ نوارا کی ٹیوڈلا۔ مرسیہ کی جمیلہ اور پھر اُندلس کی منزانیلا، مونتیلا اور شیری وغیرہ۔ ہر ڈرم کے پیندے کے قریب ایک ٹونٹی لگی تھی، جسے گھما کر مگ میں شراب بھر لی جاتی۔ ہسپانیہ کے اکثر شراب خانوں کی طرح یہ جگہ بھی بے حد پُرسکون تھی۔ لالٹینوں کی مدھم روشنی میں چند خوش لباس بوڑھے اور عورتیں صوفوں پر براجمان شراب نوشی میں مشغول تھے۔ حسبِ معمول ان کے بچے بھی ہمراہ تھے جن کے لیے دودھ کا انتظام کیا گیا تھا۔

"لاکومیدا سینیور؟" ٹونی نے کاؤنٹر پر جا کر مالک سے کھانے کے بارے میں استفسار کیا جو اس وقت ایک ڈرم کی ٹونٹی چمکانے میں مصروف تھا۔

"سی سینیور!" اس نے سر ہلایا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ہمیں شراب خانے کے کونے میں واقع ایک تنگ دروازے کے پاس لے گیا۔

"لاکومیدا" اس نے سال خوردہ لکڑی کی ان بھربھری سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو دوسری منزل تک جا رہی تھیں۔

سیڑھیاں طے کر کے ہم اُوپر پہنچے تو اپنے آپ کو کسی ہوٹل کے ڈرائنگ روم کی بجائے سیدھے سادھے گھریلو قسم کے کمرے میں پایا جس کے وسط میں ایک میز کے گرد درمیانی عمر کا ایک ہسپانوی، اس کی پستہ قد بیوی اور گول مٹول لڑکا بیٹھے شاید ہماری ہی راہ تک رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ٹونی نے ایک مرتبہ پھر "لاکومیدا" والا مدعا پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بیان کیا۔ مرد نے بڑی مستعدی سے میز اور دو کرسیاں کمرے کے باہر بالکونی پر لگا دیں اور کمر تک جھک کر تقریباً کورنش بجا لایا "تشریف رکھیے سینیور!"

یہ بالکونی ایک چھوٹے سے پُررونق چوک کی جانب کھلتی تھی جس کے درمیان

میں نصب قدیم وضع کے ایک کھمبے کے لالٹین نما شیڈ میں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کھجور کے دو درخت ہماری بالکونی کے پہلو میں سے اُٹھ کر اردگرد کے مکانوں کی چھتوں سے بھی اُوپر نکل گئے تھے۔ بے شمار لوگ کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا زمین پر آلتی پالتی مارے ایک موٹے بوڑھے کے بوٹ پالش کر رہا تھا۔ بُرش چلاتے چلاتے وہ لمحہ بھر کے لیے رُکتا "اولے" کا ایک زوردار نعرہ بلند کرتا اور پھر سر ہلاتا ہوا پالش کرنے میں مگن ہو جاتا۔ چند نوجوان سامنے کے مکان کی دیوار پر چسپاں بُل فائٹ کے پوسٹروں کے سامنے کھڑے بڑے زور شور سے کسی گزشتہ بُل فائٹ کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک ہسپانوی عورت بڑے اطمینان سے اپنے بچے کو دودھ بھی پلا رہی تھی اور بُل فائٹ والی بحث میں بھی حسب مقدور حصہ لے رہی تھی۔ اس ہجوم سے الگ تھلگ روشنی کے کھمبے کے نیچے دو نوجوان سر جھکائے گٹار پر کوئی اُداس اور سُست رو دُھن چھیڑ رہے تھے...... یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چھوٹا سا چوک اپنی ذات میں بالکل مکمل ہے۔ روشنی کا ایک قدیم کھمبا، کھجور کے دو درخت، بُل فائٹ کے پوسٹر، دو نوجوان موسیقار اور اس میں موجود لوگ اپنی اس مختصر دنیا سے اتنے مطمئن کہ انھیں نظریں اُٹھا کر ہماری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں۔

"میِنو تورستیکا سینیور!" قہوہ خانے کے مالک کے لڑکے نے ہسپانوی حکومت کی جانب سے خصوصی طور پر غیر ملکی سیاحوں کے لیے منظور شدہ کھانے کی فہرست ہمارے آگے رکھ دی۔

"مینو تورستیکا" میں درج شدہ کھانے روائتی ہونے کے علاوہ ارزاں بھی ہوتے ہیں۔ چالیس پسیتے یعنی تقریباً چھ روپے میں سوپ کا پیالہ، خوراک کی ایک پلیٹ، سویٹ ڈش، انگوروں کی سُرخ شراب کا ایک مگ اور کافی۔ ٹونی تو ایسے

باشندوں کی مرغوب خوراک بھنا ہوا اکیکڑا کھانا چاہتا تھا اور میں تندور میں دم پخت کی گئی ٹراؤٹ مچھلی۔ ہماری پسند معلوم کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی باورچی خانے میں جا کر کھانے کی تیاری میں معروف ہو گئے اور اُن کے لڑکے نے میز پر صاف ستھرا کپڑا بچھا کر اس پر بڑے قرینے سے چھری کانٹے اور چینیوں کے پیالے سجا دیے۔ کھانے کی تیاری کے دوران میں ہم خستہ ڈبل روٹی پر ثوریا کا مشہور اور مزے دار مکھن لگا کر کھاتے رہے اور اپنی بھوک چمکاتے رہے۔

پہلے کچے ٹماٹروں اور کالی مرچ سے تیار شدہ "گازپاچو" نامی ٹھنڈا سوپ آیا۔ پھر ٹونی کے سُرخ کیکڑے کا ورود ہُوا جس کی لاتعداد پتلی پتلی ٹانگیں پلیٹ سے باہر رینگ رہی تھیں۔ یُوں لگتا تھا ابھی چھلانگ لگا کر ٹونی کی داڑھی میں جا گھسے گا۔ میری ٹراؤٹ مچھلی بھی سالم تھی مگر کانٹا چھونے سے چھوٹے چھوٹے خستہ ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ کھانے کے بعد کافی آ گئی اور ہم کرسیوں پر دراز ہو کر نیچے چوک میں بجنے والی گٹاروں کی موسیقی سے لُطف اندوز ہونے لگے۔

نوجوان موسیقار پاپ موسیقی بجانے والوں کی مانند اپنی گٹار کے تاروں کو بے رحمی سے جھنجھوڑنے کی بجائے انھیں نہایت نرمی سے ہلکے ہلکے چھو رہے تھے۔ دُھن قدرے شوخ ہوتی تو بھی چھیڑ چھاڑ میں پیار کا عنصر ہی غالب رہتا۔ "فلیمنکو" کی یہ روائتی دُھن گٹار پر بجانے کے علاوہ گائی بھی جاتی ہے۔ مالا گوسا اور فنڈ گوس بھی اسی موسیقی کی شائقین ہیں۔ اگرچہ یہ نوجوان صرف اپنی تفریح کی خاطر گٹاریں بجا رہے تھے مگر جب کبھی اُن کی دُھن میں کوئی خصوصی لَے اُبھرتی تو چوک میں بیٹھے لوگ نعرہ ہائے "اولے اولے" بلند کر کے انھیں داد سے نوازتے۔ ہوا کے لطیف جھونکوں سے کھجور کے پتے آہستگی سے حرکت کرتے اور ان کے متحرک سائے بے فکر بوڑھوں اور زندہ دل نوجوانوں کے چہروں پر کھیلنے لگتے۔

نصف شب کے قریب چوک خالی ہونا شروع ہو گیا۔ نوجوان موسیقاروں

میں سے ایک نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور پھر چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں مسکرائے اور پھر گٹاریں کاندھوں پر ڈال کر چوک سے باہر سڑک کی جانب چل دیے۔

"شراب نہایت عمدہ تھی" ٹونی نے تقریباً اُونگھتے ہوئے کہا۔ "یار ایک سگریٹ تو پلاؤ۔"

"باہر چل کر پیتے ہیں" میں نے میز پر سے چنبیلی کا گجرا اُٹھاتے ہوئے کہا۔ اپنے اپنے حصّے کا بل ادا کرنے کے بعد ہم سیڑھیاں اُتر کر نیچے شراب خانے میں آ گئے۔

"مونتیلا" ٹونی نے اپنا بچا ہُوا مشکیزہ کاؤنٹر پر رکھ کر اپنی پسندیدہ شراب کے ڈرم کی جانب اشارہ کیا۔ مالک نے مشکیزے کا منہ ٹونٹی پر کسا اور پھر اُسے لبالب بھر کر ٹونی کے حوالے کر دیا۔ "بچاس پیسیتے" قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے مشکیزے کا خمار آور بوجھ کاندھے پر لادا اور ہم دونوں شراب خانے سے باہر آ گئے۔ گلی کے نکڑ پر چنبیلی کے گجرے بیچنے والی بڑھیا اب سر جھکائے اپنی ہتھیلی پر پیسے سکے گننے میں معروف تھی۔ پھولوں کی ٹوکری خالی ہو چکی تھی۔ ہم گلی سے نکل کر ایک مرتبہ کالے ٹیے کلاڈو کی بڑی سڑک پر آ نکلے۔

"کرائسٹ!" ٹونی کا چہرہ یوں متغیر ہُوا جیسے اُسے مرگی کا دورہ پڑنے والا ہو۔ "بلاڈی سنتنصر" اس نے چیخ کر کہا "مجنی لڑکیاں! ہائے ہائے!"

ٹونی درست کہہ رہا تھا۔ ہم لاتعداد لڑکیوں کے نرغے میں تھے۔ ہمارے چار سُو کالے ٹیے کلاڈو کی سڑک پر لڑکیوں کا ایک ہجوم خراماں خراماں شاید معطر معطر بھی چلا جا رہا تھا۔

"ہے ترو" ایک پستہ قد ہسپانوی لڑکی نے ٹونی کی کمر میں اپنے پنکھے کی ڈنڈی گھونپتے ہوئے غصے سے کہا۔ "شرم نہیں آتی پاسیو کے آداب کی خلاف ورزی

کرتے ہوئے؛ دوسری جانب چلو۔ لڑکوں کے ساتھ!"

"شکریہ سینیوریتا" ٹونی جھک کر آداب بجالایا۔ "اگر میں "تورو" یعنی بَیل ہوں تو کیا میں آپ پر حملہ آور ہو جاؤں؟"

موٹی خاتون نے ہسپانوی میں جو کچھ بھی جواب دیا وہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔ البتہ لہجے سے محسوس ہو گیا کہ "قطعے منہ" قسم کا لفظ ادا ہوا ہے۔

سڑک کے نصف حصّے میں نوجوان لڑکیاں دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بڑے طمطراق سے چل رہی تھیں۔ دوسری جانب لڑکوں کے گروہ رواں دواں تھے۔ مگر ان کا رُخ مخالف سمت میں تھا مری کی مال روڈ کی طرح یہاں بھی ٹریفک دو حصّوں میں منقسم تھی۔ لڑکیاں دھیرے دھیرے سڑک کے آخر میں واقع چوک تک پہنچتیں اور پھر فوجی انداز میں ایک دم گھوم کر واپس ہو جاتیں۔ اُدھر لڑکے بھی سڑک کے مخالف سرے پر پہنچ کر اباؤٹ ٹرن ہو جاتے اور یہ پریڈ یونہی جاری رہتی۔ پریڈ یعنی "پاسیو"۔

"شام کا پاسیو" ہسپانیہ کی ایک خوبصورت اور رُومانی رسم ہے جو آہستہ آہستہ بڑے شہروں میں جدید زندگی کی گہما گہمی سے خوف زدہ ہو کر دور افتادہ قصبوں اور چھوٹے شہروں میں سمٹ رہی ہے۔ "پاسیو" کا لفظ بُل فائٹ کے آغاز میں بُل فائٹر اور اُس کے معاونین کی پریڈ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر شام کے پاسیو میں صرف پریڈ کی قدر مشترک ہوتی ہے۔ جہاں بُل فائٹ میں مدِ مقابل کو زیر کرنے کے لیے نیزے اور تلوار کی کاٹ کام آتی ہے وہاں "شام کے پاسیو" میں جیتنے کے لیے حُسن کی شوخیاں بھرپور وار کرتی ہیں۔ اُدھر نیزے کی انی جسم میں پیوست ہو کر کام تمام کرتی ہے اور ادھر اس دیس میں جہاں چشمِ غزال عام ہے اب بھی نگاہوں کے تیر ہی دل نشیں ہوتے ہیں۔ ایک میدان میں بُل فائٹر کا مقدر لازمی جیت ہوتا ہے اور بُل کی قسمت میں ہمیشہ سرنگوں ہونا اور اس

سڑک پر "پاسیو" میں دونوں فریق ہار جیت سے بے نیاز صرف گھائل ہونے کے لیے ہی حصہ لیتے ہیں۔ "پاسیو" کی رسم کا آغاز عربوں کے زمانے میں ہوا۔ اور اسی لیے آج بھی اس میں مشرقی حجاب کی خوشبو ہے۔ ہسپانیہ کے صوبے کی عورتیں اسی مشرقی حِس کی بنا پر اپنا چہرہ رُومال سے ڈھانپ کر گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ سینکڑوں برس گزرنے کے باوجود وہ اپنے عرب ماضی کی ایک روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ پردہ کرتی ہیں۔

ہسپانیہ میں شادی کے رسم و رواج کچھ کچھ ہمارے ملک کے ساتھ لگا کھاتے ہیں۔ شادی سے پیشتر آزادانہ میل ملاپ گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اگر والدین کی رضا شامل ہو تو ایک مختصر سی کورٹ شپ کی اجازت مل جاتی ہے جو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق سرانجام پاتی ہے۔ مثلاً لڑکا کلیسا میں عبادت کرتے وقت لاٹ پادری کا "تم سب یسوع کی بھیڑیں ہو" والا وعظ سننے کی بجائے اپنی پسندیدہ لڑکی کو گھور سکتا ہے۔ محبوبہ کی بالکونی کے نیچے سے گزر ہو تو ایک آدھ آہ بھرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ نوجوان اگر شادی پر مائل ہو تو سینما جانے کی اجازت بھی مل سکتی ہے۔ شو کے دوران وہ رواج کے مطابق اپنی محبوبہ کا ہاتھ پورے تین منٹ کے لیے تھام سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر تین منٹ سے زیادہ کا عرصہ ہو جائے تو لڑکی اُسے اپنی بے عزتی سمجھتی ہو گی اور اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتی ہو گی۔ ان کٹھن رُومانی مرحلوں کے درمیان چند متعین عشقیہ تقاریر بھی ہوتی ہیں جو صدیوں سے کسی ردّ و بدل کے بغیر رائج ہیں۔ ان میں ذرہ بھر تحریف لڑکے کو عمر بھر کنوارہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ مثلاً وہ جذباتی ہو کر یہ تو کہہ سکتا ہے کہ "کنول کے پھول مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں اور آپ بھی......" لیکن اگر وہ بلا تکلف "ہائے تم مجھے پیاری لگتی ہو" پر اتر آئے تو کشیدگی بڑھنے کا امکان ہوتا ہے۔ ہسپانیہ میں اگر آپ کسی لڑکی کو باہر لے جانا چاہیں (باہر لے جانے سے مراد سینما وغیرہ دکھانا

سے بھگا کر لے جانا ہرگز نہیں ، تو آپ کو بہر حال مندرجہ بالا قوانین کی پابندی کرنا ہوگی۔
اگر نہیں کریں گے تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دنیا کا بہترین پستول "لاما"
ہسپانیہ میں ہی بنتا ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں کی طرح بڑے شہروں میں رہنے
والی بیبیاں خاصی آزاد خیال واقع ہوئی ہیں مگر دور افتادہ دیہات اور ثوریا جیسے
چھوٹے شہروں میں ابھی تک ازمنۂ وسطیٰ کی ذہنیت کا راج ہے۔ ایسی جگہوں
پر میل ملاپ کے لیے پاسیو کی رسم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ہفتے میں ایک شب اس
کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ رات کے کھانے سے
فارغ ہو کر والدین قہوہ خانوں سے باہر فٹ پاتھ پر بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر کافی یا
شراب سے دل بہلاتے ہیں اور ان کے چہیتے اور چہیتیاں قسمت آزمائی کے
لیے سڑک پر گشت شروع کر دیتے ہیں۔ بائیں جانب لڑکوں کے غول کے غول
شام کے بہترین لباسوں میں نکھرے، مسکراتے آنکھیں گھماتے چلے آ رہے ہیں اور
دوسری طرف قصبے کی کنواری لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتیں "آنکھیں بائیں" کے
فوجی اصول پر عمل پیرا لہک لہک کر چل رہی ہیں۔ پوری مخلوق میں سے ایک
زہرہ جبیں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ آپس میں مشورے ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ نظارہ صرف
دُور دُور سے کیا جا سکتا ہے، پاس آئیے گا تو کرسیوں پر براجمان خواتین کے
والدین آپ کے خلاف فاؤل دے کر میدان سے باہر نکال دیں گے۔ حسینوں کی
اس پریڈ میں اگر آپ کو کوئی خاتون بھلی لگے اور وہ بھی آپ کے قریب سے گزرتے
وقت اک شانِ دلربائی سے بالوں میں لگا پھول اتار کر سونگھنا شروع کر دے تو
پھر آپ پر لازم ہے کہ دوسری شب گٹار کاندھے پر ڈالے پھولوں کا گلدستہ
ہاتھ میں تھامے اُن محترمہ کی بالکونی تلے کھڑے ہو کر "موشے میو" قسم کا گانا گائیں
لڑکی کو آپ کا گانا اور اس کے والدین کو آپ کا گلدستہ پسند آ جائے تو آپ کو
گھر کے اندر بلا لیا جائے گا۔ ذریعۂ معاش، تعلیم اور خاندان کے مکمل کوائف دریافت

کرنے کے بعد آپ کو مطلع کیا جائے گا کہ برخوردار کل اپنی اماں کو ہمارے گھر بھیج
دینا یا پھر دوسری صورت میں "خبردار جو آئندہ ہماری لڑکی کو ...." وغیرہ۔
پاسیو کی ایک لطیف روایت یہ بھی ہے کہ قصبے کی تمام لڑکیاں سڑک پر ہونے
والی پریڈ میں شریک نہیں ہوتیں بلکہ ان میں سے نسبتاً شرمیلی خواتین اردگرد کے
مکانوں کی بالکونیوں پر سج بن کر براجمان ہو جاتی ہیں۔ ان بالکونیوں کے آگے کسی
ایک رنگ کا ریشمی کپڑا لٹکا دیا جاتا ہے۔ سلاخوں سے اسی رنگ کی دیدہ زیب
جھنڈیاں اور فیتے بندھے ہوتے ہیں۔ پیدل چلنے والی خواتین تو اشاروں کنایوں
میں اپنا مدعا بیان کر لیتی ہیں، یا پھر وہ سر میں لگا چنبیلی کا پھول بھی اس کام آ جاتا
ہے مگر بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی خواتین اپنی پسند کا اظہار بالکل انوکھے اور مختلف
طریقے سے کرتی ہیں۔ ان کے پاس کاغذ کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گیند ہوتے
ہیں جن کے ساتھ تقریباً دو گز لمبے دو تین پتلے کاغذ کے فیتے چپکے ہوتے ہیں۔
ان فیتوں کا رنگ وہی ہو گا جو بالکونی سے لٹکنے والے کپڑے اور جھنڈیوں کا ہوتا
ہے۔ ادھر نگہ انتخاب کسی خوش قسمت پر ٹھہری اور ادھر اس شرمیلی بی بی نے
بالکونی سے جھک کر ایک عدد گیند تاک کر دے مارا۔ گیند کے درمیان ایک ابھری ہوئی
چھوٹی سی پن لڑکے کے لباس میں اٹک جاتی ہے اور وہ اس کے پیچھے لہراتے
ہوئے فیتوں کا رنگ دیکھ کر جان جاتا ہے کہ جانِ جاں کس بالکونی میں تشریف فرما ہے۔
بہرحال اس وقت میں ایک بھینسا نما انگریز کے ساتھ ثوریا کی کالیے دے کلاڈ ڈ
پر کھڑا تھا اور ہمارے گرد خوبصورت پاسیو جاری تھا۔ ٹونی ابھی تک موٹی لڑکی کے
عطا کردہ خطاب "سے نورو" پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "بل فائٹر کی بچی" وہ بار بار
بڑبڑاتا۔ ہم دونوں ایک ہی جگہ پر کھڑے بیوقوفوں کی طرح دائیں بائیں اور اوپر
بالکونیوں کی جانب آنکھیں گھما رہے تھے کہ فٹ پاتھ کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا
بوڑھا اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔

"سینیور! آپ شاید غیر ملکی ہیں۔" اس نے ملائمت سے کہا۔ "اگر آپ پاسیو میں شامل ہونا چاہتے ہوں تو براہ مہربانی لڑکوں کے حصے کی طرف چلے جائیے۔ یوں لڑکیوں کے بیچ کھڑے ہونا خلافِ آداب ہے۔"

"ضرور۔ ضرور۔" ٹونی نے مرعوب ہو کر کہا اور ہم دونوں دوسری جانب جا کر پاسیو میں پریڈ میں شامل ہو گئے۔ اکثر لوگ ٹونی کو بے حد دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پستہ قد ہسپانیوں کے درمیان وہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے بونوں کی دنیا میں کوئی بارلیش دیو گھس آیا ہو۔ وہ بے حد تیز چل رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹونی میرے بھائی ذرا آہستہ........ اطمینان سے۔ ہمیں کونسا گاڑی پکڑنی ہے۔ ہر لڑکی کو گھورنے کی بجائے صرف ایک کو منتخب کرو اور اس پر نگاہیں مرکوز رکھو۔"

ہسپانوی سینیوریتا! گرمیوں کے ہلکے پھلکے شوخ لباس میں ملبوس۔ شانوں پر سفید یا کالی شال۔ کالے بھورے بالوں میں چنبیلی کے پھول۔ ہونٹوں سے دبی دبی ہنسی پھوٹتی ہوئی۔ اس کا زندہ جسم لباس کی موجودگی سے بے نیاز۔ علیحدہ اور متناسب۔ حرکت کرتا ہوا! انتخاب ہو رہا تھا۔ جو یہ مرحلہ طے کر چکی تھیں انھوں نے اپنی مسکراہٹیں بھی مخصوص کر دی تھیں۔ وہ چلتیں تو ان کی گردن دھیرے دھیرے ایک خاص زاویے سے مڑتی رہتی۔ نگاہیں اپنے پسندیدہ لڑکے پر مرکوز! ادھر وہ خوش قسمت سینیور بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر بلکہ دوسری لڑکیوں کی موجودگی سے بے خبر اسی پر نظریں جمائے اینجیلوں کی طرح چلتا رہتا۔ اگرچہ درمیانی حدِ فاصل کو عبور کرنا پاسیو کے آداب کے خلاف ہے مگر پھر بھی ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ اس غیر مرئی لکیر کے قریب تر ہو کر چلے تاکہ جونہی اس کی منزلِ مراد چلتی ہوئی نزدیک آئے سلسلۂ راز و نیاز شروع کیا جا سکے۔ پاس آتے ہی

دونوں جانب سے کھسر پھسر کا آغاز ہو جاتا۔ لڑکی مائل کرم ہوتی تو بالوں سے پھول اتار کر سونگھتی اور مسکرا دیتی ورنہ صرف خوبصورت ناک سکیڑنے سے ہی "دفع دور" کا مطلب واضح کر دیا جاتا۔

ہم ایک سجی سجائی بالکونی کے نیچے سے گزرے تو اوپر سے تین چار گیند آئے اور میری قمیض میں اٹک گئے۔ بالکونی کا رنگ نیلا تھا اور گیندوں کے پیچھے لہرانے والے لمبے فیتے بھی نیلے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا چار حسین چہرے ہسپانوی پنکھوں کی آڑ میں صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ہنستی ہوئی! شرارت سے بھرپور! دوسری بالکونی کے نیچے بھی اسی قسم کی بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کا رنگ سرخ تھا...... پھر سبز آیا۔ گیندوں کے پن مجھے چبھ رہے تھے اور ان سے چپکے مختلف رنگوں کے فیتے کسی اصیل مرغ کی دم کی مانند لہرا رہے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے انھیں قمیض سے علیحدہ کیا اور فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

"بیوقوف" میرے قریب چلتے ہوئے ایک لڑکے نے بے حد غصے سے کہا اور پھر جھک کر گیند سمیٹنے لگا۔

اس وقت تو مجھے اس کی بدکلامی پر بے حد تعجب ہوا مگر کچھ عرصہ بعد جب میں نے اس واقعہ کا ذکر میڈرڈ میں ایک دوست سے کیا تو اس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ان گیندوں کو یوں پھینک کر میں نے یقیناً بے وقوفی ہی کا ثبوت دیا تھا۔ بالکونی میں بیٹھی ہوئی کوئی بھی لڑکی جب کسی لڑکے پر فیتے والا گیند پھینکتی ہے تو یہ اس تمنا کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ پاسیو کے اختتام پر فیتوں کے رنگ کو دیکھ کر اسی رنگ کی بالکونی ڈھونڈے اور اوپر جا کر گیند پھینکنے والی خاتون کا شکریہ ادا کرے۔ شکریے کے بعد بات آگے بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ کسی لڑکے پر پھینکے جانے والے گیندوں کی تعداد سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"مستنصر ڈیئر، وہ یوتھ ہوسٹل والی لڑکی بھی یہیں کہیں ہوگی؟" ٹونی نے ایک دم خوش ہو کر پوچھا۔

"ٹونی ڈیئر، پاسیو میں صرف غیر شادی شدہ لڑکیاں ہی حصہ لے سکتی ہیں۔ فی الحال تم اس موٹی لڑکی کا خیال کرو جو پچھلے دس منٹ سے تمہیں گھور رہی ہے۔ ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

"وہ بُل فائٹر کی بچی" ٹونی نے منہ بنا کر کہا۔ "شکل سے پارک سٹائر کی گائے لگتی ہے۔"

پاسیو میں شامل لڑکے اور لڑکیاں اپنے بہترین لباسوں میں ملبوس تھے اور ادھر ٹونی صرف نیکر اور بنیان میں کسی سیارے کی مخلوق لگ رہا تھا۔ اتنی بے شمار نرم و نازک لڑکیوں کی قربت سے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ دائیں طرف دیکھتا، ہنسی کر کے ہنستا، بائیں جانب نگاہ دوڑاتا تو اس کی آنکھیں اُبلنے کو آتیں۔ اُوپر نظر ڈالتا تو گردن اکڑ کے رہ جاتی۔ وہ یوں منہ اُٹھائے گھوم رہا تھا جیسے کوئی اڑنا بھینسا چینی کے نازک ظروف کی دکان میں آگھسا ہو۔

"اوہ لالا" ٹونی کی نظر ایک نہایت خوبصورت لڑکی پر پڑی اور اس نے منہ میں انگلیاں گھسیڑ کر سیٹی بجا دی۔ ہمارے آگے چلنے والے چند لڑکوں نے ایک دم مڑ کر ٹونی کو گھورا اور پھر اس کے تن و توش کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کچھ کہے بغیر دوبارہ چلنے لگے۔

"ٹونی ڈیئر کیوں رنگ میں بھنگ ڈالتے ہو؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"سوری" اس نے کندھے سکیڑ دیئے۔

میں ایک منجھے ہوئے سیاح کی مانند پاسیو میں شامل لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے نقش و نگار سراسر مشرقی ہیں...... قد نسبتاً چھوٹے...... رنگت کھلتی ہوئی۔ آنکھیں سیاہ یا بھوری، صحت مند۔ چال پُر وقار۔ پاؤں

بے حد نازک...... اور ہونے بھی چاہئیں۔ مصنف ایڈورڈ ہٹن ایک مکمل عورت کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے کہ وہ گردن تک انگریز ہو۔ کمر تک فرانسیسی، اُس کے نیچے ولندیزی اور اس کے پاؤں ہسپانوی۔ ہٹن نے ہسپانوی عورت کو ایک اور خصوصیت سے بھی نوازا ہے۔ میں فی الحال اس خاصیت کے بارے میں حتمی فیصلہ دینے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ انگریز عورت چائے بناتے وقت، فرانسیسی عورت رقص کرتی ہوئی، ولندیزی باورچی خانے میں، اطالوی کھڑکی میں اور ہسپانوی بستر میں...... بے حد خوبصورت لگتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

میں یونہی بے دھیانی سے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پاسیو کے رومانی ماحول میں کھویا ہُوا۔ دبی دبی ہنسی، نازک قدموں کی چاپ، حسین چہرے ایک فلم کی مانند گزرتے رہے اور پھر ایک لڑکی...... پُرکشش انداز میں چلتی ہوئی۔ شانوں پر سفید شال۔ بالوں کے جُوڑے میں چنبیلی کے شگوفے سجے ہوئے، سنجیدہ اور اُداس۔ آنکھیں کالی بھوری...... مجھ پر! قدیم کھمبوں کی ناکافی روشنی میں اس کا تصویر چہرہ۔ قدیم اور پُراسرار۔ انجانے احساسات کی آماجگاہ...... وہ گزر گئی! میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا...... وہ مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی...... پاسیو جاری تھا، میں ثوریا میں تھا۔ ثوریا جو صرف چند گھنٹے پیشتر میرے لیے ایک اجنبی شہر تھا جس کے نسوانیت سے بھرپور نام سے میں اب تک ناآشنا تھا۔ ثوریا ثریا بھی ہو سکتا تھا...... جس کے وجود سے میں بے خبر تھا۔ میرے لیے ثوریا کہیں بھی ہو سکتا تھا...... افریقہ، ایشیا۔ کہیں بھی! لیکن وہ تو ہسپانیہ کے صوبے قشتالیہ میں مغشی پہاڑیوں کے درمیان آباد تھا۔ صدیوں سے۔ اس اجنبی شہر کی یہ شام جسے مچادو نے "ثوریا کی پُراسرار شام" کہا تھا مجھے یہاں کھینچ لائی تھی یا پھر ثوریا اور اس کی یہ شام دونوں غیر اہم تھے۔ صرف ایک قدیم اور پُراسرار چہرہ میری آمد کا ہمیشہ سے منتظر تھا۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ اُسے تلاش کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ وہ سب سے ممتاز

نظر آ رہی تھی...... سفید شال لپیٹے خاموش آنکھوں والی لڑکی۔ اُس کے نوجوان چہرے پر اُمید اور مایوسی کی پرچھائیاں تھیں، وہ میرے قریب سے گزرتی تو آنکھیں جھکا لیتی...... میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا تو اس کی لمبی پلکیں بھوؤں کو چھو رہی ہوتیں ٹھنڈی آگ کی آماجگاہ۔ اُداس آنکھیں...... پاسیو جاری رہا اور وقت گزرتا رہا۔ شاید صدیاں بیت گئیں۔

ثوریا کی شب بھیگ رہی تھی۔ کالیے دے کلاڈو کے سوا تمام گلی کوچوں کی روشنیاں ایک ایک کر کے بجھتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ میرے قریب پہنچی تو اس کے قدم رُک گئے۔ اُس کی خوابیدہ آنکھیں مجھ پر تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ اے اجنبی تم آج کی شب ثوریا میں کیوں چلے آئے؟...... تم نے اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کسی اور راستے کا تعین کیوں نہ کر لیا۔؟ اُس نے اپنی گردن میں ہلکا سا خم دے کر بالوں میں سے چنبیلی کا ایک شگوفہ اُتارا۔ اُسے اپنے لبوں سے چھوا، اور پھر سر جھکا کر چلی گئی...... چنبیلی کا شگوفہ وہیں سڑک پر پڑا تھا اور پاسیو میں حصہ لینے والی لڑکیاں اُسے روندتی ہوئی چلی جا رہی تھیں...... ایک مختصر چاہت! آغاز کے بغیر ایک اُداس انجام۔

ہم ہوٹل واپس آ رہے تھے تو پاسیو کی خوشبو میرے بدن میں رچی ہوئی تھی۔ دبی دبی ہنسی اور سینکڑوں قدموں کی چاپ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ہمارے چہرے اس انوکھے اور خوبصورت تجربے کی شدت سے دمک رہے تھے۔ سیاحت تو دیوانگی ہے، مگر ثوریا کو چھوڑ کر چلے جانا بھی تو دیوانگی تھی، مجھے کل صبح ثوریا چھوڑ کر چلے جانا تھا۔ کل! اور آج...... ؟ آج میں نے قشتالیہ کے ان دُور دراز ریگزاروں کے درمیان کوہستانی راستوں اور اجنبی گھاٹیوں میں گھرے اس شہر ثوریا میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سفید شال میں لپٹی، بالوں میں چنبیلی کے پھول سجائے اپنے راستے پر چلتی گئی۔ جانے کون؟ اُسے

شاید کبھی خیال بھی نہ آئے گا کہ ایک مرتبہ ایک گمنام غیر ملکی ثوریا کی پُراسرار شام میں اس کی آنکھوں میں سے نکلنے والی اُداس کالی شعاعوں کی زد میں آیا تھا۔ جانے وہ کہاں رہتی ہو گی...... اس کا پس منظر کیا ہو گا۔ جوں جوں میں کالیے دے کلاڈو سے دُور ہوتا گیا وہ لڑکی ایک تجربے کی بجائے ایک واہمے، ایک خواب کا رُوپ دھارتی گئی...... ابھی سے! آج! اور کل یہ خواب یادوں میں بدلیں گے اور پھر وقت کی پرواز کے ساتھ یہ یادیں بھی دھندلانے لگیں گی۔ کاش میرا بے کار ذہن اس قابل ہوتا کہ یادیں حنوط کر کے اس میں محفوظ رکھی جا سکتیں۔ مگر یادوں میں ہمیشہ تازگی کی مہک نہیں آ سکتی۔ نرم و نازک یادوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ وہ خزاں رسیدہ پتّوں کی مانند بکھر جاتی ہیں، چنبیلی کے شگوفوں کی طرح بالآخر کچلا جاتی ہیں۔ افلاطون نے کہا تھا: "ہر خوشی ایلیس کے فوارے کی مانند ہے جس کا پانی حکایت کے مطابق محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ سو ہر لمحے کو اپنے ساتھ وہ تمام خوشیاں لے جانے دو، جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔"

اُس رات جب میں سویا تو ثوریا کی شام کے وہ لمحے مجھ سے دُور ہوتے گئے جن میں حاصل کردہ خوشیاں ایلیس کے فواروں کے پانی کی طرح لاکھ چاہنے پر بھی میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہو سکتی تھیں۔ تمام شب ثوریا کا مترنم اور نسوانیت سے بھرپور نام میرے ذہن کی خاموش جھیل پر چاندی کی بارش کی طرح برستا رہا —— ثوریا! ثوریا! ثوریا!

مدینہ سالم

دوسری صبح روانگی سے پیشتر ہم نے حسبِ سابق ہوسٹل کے وسیع غسل خانے کے تمام شاور زکھول کر غسل فرمایا اور حسبِ معمول بجرپی زیب تن کر کے مائل بسفر ہوئے۔ ادھر ثوریا سے نکلتے ہی اوّلین پٹرول پمپ کی قربت سے جیپ ڈیئر کی پیاس بھی عود کر آئی اور وہ بھلی مانس تب تک ٹس سے مس نہ ہوئی جب تک اس کے شکم میں مبلغ تین سو پسیتے کا پٹرول نہ انڈیل دیا گیا۔

ہم ثوریا کی بنفشی پہاڑیاں عبور کر رہے تھے تو میں نے شہر پر آخری نگاہ ڈالی۔ قشتالیہ کے دور دراز ریگزاروں کے درمیان کوہستانی راستوں اور گھاٹیوں میں گھرے اس شہر کی جانب جہاں کل شب پاسیو میں، مَیں نے اُداس آنکھوں والی ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ سفید شال۔ سفید چنبیلی کے پھول ——— شاید وہ بھی اس وقت سفید روشنی میں نہائے ہوئے سرخ چھتوں والے کسی مکان کے آنگن میں بیٹھی اس اجنبی کے بارے میں سوچ رہی ہو گی، جو اُس کی آنکھوں سے نکلنے والی شعاعوں کی زد میں آیا تھا۔

"کیوں بھئی مُوسٹان کیا سوچ رہے ہو؟" ژونی نے ایک ہاتھ سے سٹیرنگ وہیل کو سہارا دیا اور دوسرے سے مشکیزہ پچکا کر شراب کی ایک پتلی دھار حلق میں اُتارتے ہوئے پوچھا۔

"ہُوں!" ثوریا کا سحر ریزہ ریزہ ہو گیا "کچھ بھی نہیں" میں نے سر جھٹکا اور

ڈیش بورڈ میں سے ہسپانیہ کا نقشہ نکال کر اپنے گھٹنوں پر پھیلا لیا۔

اَل میزان کے قصبے کے قریب ہم نے ایک مرتبہ پھر دریائے دویرو عبور کیا۔ اگلا قصبہ مدینہ سلی تھا جہاں ہم دس بجے کے قریب پہنچ گئے۔ قصبے سے باہر ہم ایک قہوہ خانے میں ناشتے کے لیے رُک گئے۔ میرے سامنے عربوں کا مدینہ سالم خشک اور بنجر پہاڑیوں کے درمیان ایک عمر رسیدہ بوڑھے کی مانند تیز دھوپ میں سستا رہا تھا۔ زندگی کی حرارت اور گہما گہمی سے یکسر عاری، ایک معمولی اور غیر مؤثر قصبہ۔ المنصور ابن عامر یہیں کہیں ان سفید مکانوں اور چٹیل پہاڑیوں تلے ابدی نیند سو رہا تھا۔

قرطبہ کے ایک وکیل کا بیٹا عامر جس کے لیے دربار میں ایک معمولی عرضی نویس کی ملازمت اس سنہری زینے پر پہلا قدم ثابت ہوئی جس کی معراج اُسے اندلس کی وزارتِ عظمیٰ تک لے گئی۔ زمانۂ طالب علمی میں مسجد قرطبہ کے صحن میں اُسے بے حد سنجیدہ اور خاموش دیکھ کر اس کے دوستوں نے پوچھا "عامر تم آج اتنے خاموش کیوں ہو؟"

اُس نے نہایت متانت سے جواب دیا "میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں جب مجھے اندلس کی وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہو کر اس ملک کے تمام مسائل حل کرنا ہوں گے" اس کے دوست بے حد محظوظ ہوئے اور ہنسنے لگے۔ عامر نے غصے سے کہا "میں واقعی عنقریب اندلس کا وزیراعظم ہونے کو ہوں۔ ابھی وقت ہے اپنے لیے جو کچھ مانگنا ہے مانگ لو" ایک نے مالقہ کا قاضی بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دوسرے نے پولیس کے حاکمِ اعلیٰ کا عہدہ مانگا۔ تیسرے نے کہا۔ مجھے باغات کا شوق ہے، میں قرطبہ کے باغوں کا نگران بننا پسند کروں گا۔ چوتھے دوست نے آگے بڑھ کر منصور کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا اور حقارت سے کہنے لگا "تیری اگلی بارہ پشتوں میں بھی کوئی

اگر اندلس کی وزارتِ عظمیٰ کو پہنچا، تو مجھے گدھے پر اُلٹا سوار کر کے شہر میں گشت کروانا۔ چند برس بعد قرطبہ کے بچّوں کے جمِ غفیر کے درمیان یہی طالب علم گدھے پر اُلٹا سوار اس روز بد کو کوس رہا تھا جب اُس نے اپنی رضامندی سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

تاریخ دان لین پول کے مطابق عبد الرحمٰن سوئم نے جس عظیم اندلس کے خواب دیکھے تھے، ان کی تعبیر المنصور کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس کی قوتِ برداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اپنے وزرا کے ساتھ انتظامی امور پر بڑے اطمینان سے محوِ گفتگو تھا۔ یکدم دربار میں گوشت کے جلنے کی ناگوار بو پھیل گئی معلوم ہُوا کہ شاہی جرّاح المنصور کی ٹانگ پر آئے ہوئے ایک زخم کو گرم لوہے کی ایک سلاخ سے داغ رہا ہے۔ انتظامی امور کے علاوہ وہ فنِ حرب میں بھی باکمال تھا۔ ہر سال موسمِ بہار اور خزاں میں ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ بارسلونا، پامپلونا، نوارا، لیان اور قشتالیہ کی عیسائی ریاستوں پر حملہ آور ہوتا۔ لیان کے شہر کی فصیلیں منہدم کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے چھبیس سالہ عہد میں پچاس سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا اور ہمیشہ کامران لوٹا۔ ابن ابی عامر اسی لیے تاریخ میں المنصور یعنی فاتح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر معرکے سے واپسی پر وہ اپنے لبادے پر جمع شدہ خاک بڑی احتیاط سے جھاڑتا اور اسے ایک ڈبیہ میں محفوظ کر لیتا۔ قشتالیہ کے خلاف ایک مہم سے واپسی پر وہ مدینہ سلی میں علیل ہُوا اور چند روز بعد اندلس کا یہ جری فرزند راہیٔ ملکِ عدم ہُوا۔ اس کی وصیت کے مطابق چالیس معرکوں میں جمع شدہ خاک اس کے چہرے پر چھڑکی گئی۔ اور اُسے اُس کفن میں دفنایا گیا جو اس کے ذاتی کھیت کی روئی سے اس کی اپنی بیٹیوں نے کاتا تھا۔ عیسائیوں نے اس کی موت پر جس طرح اطمینان کا اظہار کیا، وہ ایک راہبانہ جریدے کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے: "۱۰۰۲ء میں المنصور

مر گیا اور جہنم میں دفن ہُوا۔" تاریخ کی ایک قدیم کتاب میں اس کے کتبے کی عبارت کچھ یوں رقم ہے:۔

"اُس کی نشانیاں تمہیں اُس کی خبر بتلائیں گی۔ گویا تم اُسے
اپنے سامنے دیکھ رہے ہو۔ اُس جیسا زمانہ کبھی نہ رکھے گا!"

آج مدینہ سلی میں اس کی قبر جانے کس مکان، کون سے کوچے اور کس کھنڈر تلے ہے۔ اُس کی کوئی نشانی ہمیں اس کی خبر نہیں بتلاتی۔ ہاں تاریخ گواہ ہے کہ اُس جیسا زمانہ کبھی نہ رکھے گا۔

مدینہ سلی کے بعد ہم گواڈل جارہ کے قصبے سے گزرے جسے اہلِ عرب وادی الحجارہ بھی کہتے تھے اور مدینۃ الفرج بھی۔ یہ قصبہ جو گئے وقتوں میں ایک اہم شہر تھا۔ موسیٰ اور طارق کی متحدہ افواج کے ہاتھوں فتح ہُوا۔ مشہور مورخ اور ادیب علامہ الحجاری بھی اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔

گواڈل جارہ سے الکالے ہنارس پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی اور گرمی عروج پر تھی۔ سڑک کے کنارے ایک بوڑھا ہسپانوی چھپر تلے بیٹھا تربوز بیچ رہا تھا۔ ٹونی نے جیپ روک کر ایک تربوز خریدا جسے چیرتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر اپنی قصابیت کا مظاہرہ کیا اور نہایت نفیس ٹکڑے کاٹے۔

ہنارس ہسپانیہ کے مایۂ ناز ادیب سروانتیس کی جائے پیدائش ہے جس کی شہرہ آفاق کتاب "ڈان کے خوتے" کا حوالہ میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی قصبے سے طارق کو وہ بیش قیمت میز دستیاب ہوئی تھی جو بعد میں اس کے اور موسیٰ کے درمیان تنازعے کا باعث بنی۔

الکالے ہنارس سے کچھ فاصلے پر ہم ڈھول سے آتی ہوئی اس سڑک سے جُدا ہوئے جس نے پچھلے دو روز سے قشتالیہ کے کھلے میدانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ ہم ایک دو طرفہ اور کشادہ سڑک پر آ گئے تھے۔

بائیں ہاتھ ایک بورڈ نظر آیا "ہوائی اڈہ بائیں جانب"۔ بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ڈبہ نما جدید عمارتیں جن میں سے بیشتر زیر تعمیر تھیں۔ کرین اور بل ڈوزر سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ نیون سائن جو دن کی روشنی میں لوہے کے کھنڈر لگ رہے تھے۔ بے شمار ٹریفک۔ جلتی بجھتی ٹریفک کی روشنیاں اور بے پناہ شور۔ ہم ہسپانیہ کے دارالحکومت میڈرڈ میں داخل ہو رہے تھے۔

گویا کہ..... میڈرڈ

مسلمانوں کے عہد میں متعدد عرب قبیلے ایسے بھی تھے جو ہسپانیہ میں سینکڑوں برس سے قیام پذیر ہونے کے باوجود آبائی خانہ بدوشی کی حس کو دبا نہ پائے تھے۔ یہ قبائل شہروں سے دُور دریاؤں کے کنارے اور زرخیز وادیوں میں خیمہ زن ہوتے اور پھر جس صبح گرد و نواح کے مناظر سے اجنبیت کا پہلا پردہ سرکتا ان کے خیموں کی طنابیں ڈھیلی پڑ جاتیں، میخیں اُکھڑتیں اور وہ ایک مرتبہ پھر اَن دیکھی سرزمینوں کی تلاش میں وہاں سے کُوچ کر جاتے۔ ایک سیاح کی مانند کسی انجانے مقام پر اجنبی کی حیثیت سے وارد ہونا ان کے لیے زندگی کا سب سے بڑا جذباتی تجربہ ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی صحرانورد قبیلے نے دریائے مُنیز ناس کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر ایک حصار تعمیر کیا اور اُسے مجریط کے نام سے پکارا۔ مجریط صدیوں قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ ایسے چمکتے شہروں کی روشنی تلے گمنامی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہا۔ ۱۵۶۱ء میں فلپ دوم نے کتب خانہ و خانقاہ ال اسکوریل کی تعمیر کے دوران یہاں چند برس قیام کیا اور اس کی مرکزیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِسے ملک کا صدر مقام قرار دیا۔ اسی مرکزیت کی بناء پر مجریط جو اب بگڑ کر میڈرڈ ہو چکا ہے، ہسپانیہ کا پیٹ بھی کہلاتا ہے۔ آج سے دو سو سال پیشتر تک دریائے مُنیز ناس کے کنارے عربوں کے تعمیر کردہ حصار القصر کے کھنڈرات موجود تھے۔ اب وہاں شاہی محل کی عالی شان عمارت کھڑی ہے اور میڈرڈ اس کے گرد میل ہا میل

تک پھیلا ہوا ہے۔ ہسپانیہ کی قدیم تاریخ میں ایک نوادر شہر۔

پیرانیز کی بلندیوں اور قشتالیہ کے ریگزاروں کو عبور کر کے اب ٹونی کی جیپ کاساڈے کامپو کے جنگل میں پائن اور فر کے درختوں تلے کھڑی تھی اور ہم دونوں مڈگارڈ پر بیٹھے پچھلے دو روز کے سفر کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ ثوریا کی شب کا ذکر آیا تو ٹونی جیسا سکھ بھی جذباتی ہو گیا۔

"یقیناً ثوریا کے پاسیو میں حصہ لینے والی ہسپانوی لڑکیوں کے قدموں کی چاپ افریقہ کے جنگلوں تک میرا پیچھا کرے گی۔ واپسی پر اس قہوہ خانے میں ضرور جانا جہاں اُس شب......"

"اُس شب ٹونی ...... ابھی کل کی تو بات ہے۔"

"ہاں شاید کل ہی کی بات ہو مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ ٹونی کی حالت مزید غیر ہوتی میں نے اپنا رُک سیک کاندھے پر ڈالا اور اس سے اجازت چاہی۔

"اہم" اس نے بمشکل گلا صاف کیا۔ "یہ شہر بے جان اور ٹھول سا لگتا ہے ...... تم میرے ساتھ افریقہ کیوں نہیں چلتے؟"

"مگر مچھوں اور آدم خوروں سے ملاقات کرنے؟ ...... ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

"تم کہتے ہو تو ہو گیا" اُس نے منہ بنا کر کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم واپسی پر ثوریا ضرور جاؤ گے اور پاسیو میں شامل اُس لڑکی کو تلاش کرو گے جس نے بالوں میں چنبیلی کے پھول سجائے تھے......"

فر اور پائن کے درختوں کی چوٹیاں ایک سبز دیوار کی صورت میں سورج کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ روشنی کی ایک کرن بھی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

"نہیں ٹونی ڈیئر...... تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ صدیوں پہلے کی بات ہے۔ اگر واپس چلا بھی جاؤں تو ہو سکتا ہے اُن بنفشی پہاڑیوں کے درمیان ثوریا کا وجود بھی نہ ہو...... بہرحال لفٹ کا شکریہ! اور ٹونی تمھاری رفاقت میں یہ طویل سفر بے حد خوشگوار طریقے سے کٹا......"

"یہ تم دوبارہ کہہ سکتے ہو!...... لاؤ اب ایک سگرٹ تو پلاؤ...... اب ہوا ہے نا ایک چھوٹا سا لطیفہ۔ کیوں مُرشان؟" ٹونی کی جھاڑی داڑھی میں حرکت ہوئی اور درمیان میں سے اس کا مخصوص قہقہہ برآمد ہو گیا۔

"ہاں ہو گیا" میں نے اُسے سگرٹ سُلگا کر دیتے ہوئے اعتراف کیا۔

"خدا حافظ ٹونی!"

ایک طویل کش لگانے کے بعد اس نے داڑھی کھجلائی۔ میرے دونوں کندھوں پر تھپکی دی اور جیپ میں سوار ہو کر چابی گھما دی۔ درختوں میں چند نیم خوابیدہ پرندے انجن کی آواز سے خوفزدہ ہو کر پھڑپھڑائے۔ کاساڈے کامپو کی پگڈنڈی پر دُھول اُٹھی اور ٹونی کی جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پائن کے ایک درخت کے تنے پر "یوتھ ہوسٹل بائیں جانب" کی تختی آویزاں تھی۔ میں ایک پہاڑی قلی کی طرح کاندھوں پر بوجھ اُٹھائے سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جنگل کے وسط میں لکڑی کے ایک کرم خوردہ پھاٹک پر "میڈرڈ یوتھ ہوسٹل" کے الفاظ لکھے دکھائی دیئے۔ کواڑ دھکیل کر میں نے اندر جھانکا۔ دُھول میں اَٹا ہوا ایک وسیع و عریض سنسان صحن میڈرڈ کی تپتی دوپہر میں چمک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک بیرک نما سادہ سی عمارت تھی۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب میں عمارت میں داخل ہوا تو اندر بالکل خاموشی تھی ٹھنڈک اور نیم تاریکی۔ میں نے رُک سیک کاندھے سے اتار کر اپنے تئیں ایک خالی بستر پر رکھ دیا۔

"کون ہے؟" بستر پر لیٹے ایک ہیولے نے اپنے پیٹ پر رکھے رُک سیک کو بے حد خوف زدہ ہو کر ٹٹولتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں ہوں!" میں نے جلدی سے رُک سیک اُٹھا لیا۔ "یہ جگہ یُوتھ ہوسٹل ہی ہے نا؟"

"یہ جگہ ...." ہیولے صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر جھک گئے "یہ جگہ قدیم مصر ہے۔ فرعون رمسیس کی سواری آ رہی ہے۔"

"ہیلو" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"ہائے! ہائے! ہا......." مخالف سمت میں ایک بنکر پر آدھا لیٹا آدھا بیٹھا ہپی غنودگی کے عالم میں بڑبڑایا۔

"ہلو! ہلو!" کسی صاحب نے بنکر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر میری ٹانگ پکڑ لی۔

"آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔" میں نے مسکرا کر نیچے جھانکا۔

نیم وا مسکراہٹ لبوں پر سجائے اب وہ صاحب گٹار کو آغوش میں دبوچے اُونگھ رہے تھے۔

میری نظریں تاریکی کی عادی ہوئیں تو انکشاف ہُوا کہ ہوسٹل کے بنکروں پر درجنوں حضرات نروان کی مختلف منزلوں کی طرف رواں ہیں۔ ایک حبشی لڑکا میری جانب ٹکٹکی باندھے تب تک آنکھیں جھپکاتا رہا جب تک میں نے بھی اُسی رفتار سے آنکھیں جھپکا کر اُسے "ہیلو" نہ کہہ دیا۔ قندھار کے ہوٹل میرواعظ میں جس بُو سے واسطہ پڑا تھا اُس کی مہک ان فضاؤں میں بھی رچی بسی تھی۔

اتنے میں ہوسٹل کی ایک کھڑکی کے پٹ کھلے اور ایک یونانی نقوش کا حامل نوجوان چھلانگ لگا کر اندر آ گیا۔

"کھڑکی!....... بند کر دو۔ روشنی!....... نہیں چاہیے۔" منگ باباؤں

نے آنکھیں ڈھانپتے ہوئے دھیرے دھیرے احتجاج کیا۔ نوجوان نے بآوازِ بلند ہسپانوی میں چند ناپسندیدہ الفاظ کہے اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔

"آپ بھی شاید میری طرح یہاں نووارد ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں، نہیں......." اس نے شانوں تک آئی ہوئی زلفوں کو جھٹکا اور بے دھیانی میں بولا "میں تو وارڈن کی لڑکی سے ملنے گیا تھا۔ پچھلے بیس رُوز سے تپسیا کر رہا ہوں مگر وہ کمبخت تو برازیلین لڑکیوں سے بھی گئی گزری ہے۔ مانتی ہی نہیں۔ ہر روز لِپوری وو پیروارڈن صاحب اپنی چہیتی مریضوں کو واٹ ڈالتے ہیں اور میں ان کی چہیتی .... خیر....... تم کون ہو؟"

میں نے اپنا تعارف کروایا۔

"اچھا اچھا تو ایسے ہوتے ہیں پاکستانی!" اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا "تم میرے پہلے پاکستانی ہو" اور پھر بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "میرا نام بانکو ہے۔ برازیل سے آیا ہوں۔ عرفِ عام میں مجھے بانکو دی برازیلین کہا جاتا ہے۔ میڈرڈ تو پسند نہیں آیا، البتہ یہاں کے وارڈن کی بیٹی پسند آ گئی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہوٹل کے کسی بھی مکین کو میڈرڈ پسند نہیں آیا جو ہمہ وقت شہر کی سیر کی بجائے عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہیں۔"

"یہ حضرات؟" اس نے اونگھتی ہوئی مخلوق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

"یار تمہیں یسوع مسیح کا واسطہ۔ خاموشی سے ہنسو۔" ایک مخلوق نے احتجاج کیا۔

"ہسپانوی بندرگاہ الجیریس سے مراکش صرف دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔" بانکو نے سرگوشی کی "اور وہاں اعلیٰ قسم کی حشیش کی اتنی بہتات ہے کہ سبزی فروش بھی آلوؤں اور ٹماٹروں کے ساتھ اسے ٹوکروں کے حساب سے فروخت

کرتے ہیں چنانچہ اپنے یہ ہپی بھائی مراکش میں قدم رکھتے ہی سٹون ہو جاتے ہیں؟"

"سٹون؟ یعنی پتھر ہو جاتے ہیں؟"

"نہیں سٹون یعنی دُھت ہو جاتے ہیں۔ مکمل نروان۔ اور پھر جب تک مراکشی حکومت انھیں کان سے پکڑ کر ملک سے باہر نہیں کر دیتی یہ وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہسپانیہ واپسی پر ان کے رُک سیکوں میں غلیظ بنیانوں اور جرابوں کے نیچے سیروں حشیش بھری ہوتی ہے۔ اکثر پکڑے جاتے ہیں، اور ہسپانوی جیلوں میں سڑتے ہیں۔ جو بچ نکلتے ہیں وہ سیدھے میڈرڈ کے یوتھ ہوسٹل میں چلے آتے ہیں۔ یہاں کے وارڈن کو جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اپنی مرغیوں سے ہی فرصت نہیں۔ اس لیے یہ حضرات خوب کھل کھیلتے ہیں بلکہ کھل پیتے ہیں۔"

"یہاں خوب گذرے گی۔" میں نے اپنا سونے کا تھیلا بستر پر بچھا دیا۔ اور لیٹ کر ڈائری لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ جس مدھ بھری فضا میں سانس لے رہا تھا وہاں زیادہ دیر تک ذی ہوش رہنا ناممکنات میں سے تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں نے ڈائری بند کر دی اور اُونگھنے لگا۔

آنکھ کھلی تو دس بجنے کو تھے اور حسبِ سابق ہر سُو خاموشی تھی۔ میں نے بانکو کی جانب دیکھا وہ نہایت باربط قسم کے خراٹے لے رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور صرف ایک نیکر میں ملبوس عمر رسیدہ وارڈن کاندھے پر بندوق جمائے اندر داخل ہُوا۔ اس نے فوجی انداز میں ایڑھیوں پر گھوم کر دروازہ بند کیا اور پھر ہوسٹل کی راہداری میں باقاعدہ پریڈ کرنے لگا۔ دو چکر لگانے کے بعد اُس نے بندوق کندھے سے اتار کر بغل میں داب لی اور پورا منہ کھول کر کاشن دینے لگا۔ "لڑکو! دس بج رہے ہیں۔ اب قانونی طور پر تم اس ہوسٹل سے باہر نہیں جا سکتے۔ صدر دروازہ مقفل کر دیا گیا ہے۔ روشنیاں گُل کر دو (حالانکہ

روشنیاں پہلے سے گُل تھیں) اور سو جاؤ (سب لوگ سو رہے تھے) شب بخیر!"

اس تقریر کے بعد وارڈن نے حسبِ سابق دو مرتبہ راہداری میں مارچ گشت کی اور پھر دروازہ کھول کر پریڈ کرتا ہُوا باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ تمام مُردہ اجسام نے چھلانگیں لگائیں اور بستروں سے باہر آ گئے۔ "برا وو۔ ویوا۔ ہُرے۔" متعدد زبانوں میں زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ تمام بتیاں روشن کر دی گئیں۔ بنکر کے نیچے لیٹا ہپی گٹار بجانے لگا۔ اگر واقعی لفظوں کو بجایا جا سکتا ہے تو وُہ اس وقت بجائی جا رہی تھیں۔

"بانکو بھائی! میں نے بانکو کے "ویوا ویوا" میں مداخلت کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا سلسلے ہیں؟"

"اب میڈرڈ کی سیر کا وقت ہے...... ویوا" اس نے نعرہ لگایا۔

"لیکن صدر دروازہ مقفل ہے اور باہر وارڈن صاحب بندوق لیے ٹہل رہے ہوں گے۔"

"صدر دروازے کے پہلو میں جو پتھر نصب ہے اس پر چڑھ کر دیوار بآسانی پھلانگی جا سکتی ہے اور رہی ۱۹۳۶ء کی زنگ آلود نشانی وارڈن صاحب کی بندوق تو وہ خانہ جنگی کے بعد آج تک کارتوس کے لمس سے آشنا نہیں ہوئی بلکہ شاید اُن دنوں بھی نہیں ہوگی۔ بہرحال تم فکر نہ کرو تمام دن بستروں میں پڑے اُونگھنا اور پھر پوری شب میڈرڈ کی آوارہ گردی کرنا اس ہوسٹل کے مکینوں کی روایت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد پوری قوم سج بن کر زیرِ زمین ریلوے اسٹیشن پر میڈرڈ کے مرکز "پورتا دیل سول" جانے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ گاڑی آئی تو یوں لگا کہ جیسے مغلپورہ لوکوشیڈ میں زیرِ مرمت کسی مال گاڑی کو دھکیل کر سٹیشن کے اندر بھیج دیا گیا ہو۔ البتہ یہاں مال گاڑیوں ایسی وسعت ناپید تھی۔ ہر سو

مسافر ٹھنسے پڑے تھے۔ فیصلہ دے دیا گیا کہ گاڑی میں سوار ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ فدوی کو چونکہ لاہور کی اومنی بسوں میں سوار ہونے کا وسیع تجربہ تھا اس لیے یہاں بھی چنداں دشواری پیش نہ آئی۔

پورتا دیل سول یعنی "باب شمس" میڈرڈ کا ثقافتی اور تجارتی مرکز ہے۔ کلاسیکی طرزِ تعمیر کی چند عمارتیں ایک نیم دائرے کی شکل میں اُسے گھیرے ہوئے ہیں اور اس کے وسط میں سے میڈرڈ کی دس شاہراہیں جنم لیتی ہیں۔ ناول نگاروں نے پورتا دیل سول کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر مجھے اس "باب شمس" میں سے خوبصورتی کی کوئی شعاع طلوع ہوتی نظر نہ آئی۔ میڈریلینوز یعنی میڈرڈ کے باشندوں کی وضع قطع بھی دوسرے یورپی ملکوں کے باشندوں کی نسبت قصباتی اور عامیانہ ہے۔ البتہ ان کے چہروں پر انگریزوں کی سنجیدگی، جرمنوں کی کرختگی، روسوں کی کاروباری مسکراہٹ اور اطالویوں کی شاطرانہ ہنسی مفقود تھی۔ یہ چہرے ایک کھلی کتاب تھے۔ تازہ ہنس مکھ اور بے فکرے۔ میڈرڈ میں مجھے کوئی خاصیت ایسی نظر نہیں آئی جسے خالص میڈرڈی کہا جا سکے۔ قہوہ خانوں پر امریکی چھاپ ہے۔ ملبوسات کی دکانوں پر فرانسیسی رنگ غالب ہے اور طرزِ تعمیر بھی کسی طور منفرد نہیں۔ دل سول سے دائیں ہاتھ والی سڑک کے اختتام پر پلازا میئر کا خوبصورت چوک ہے جہاں ۱۶۸۰ء میں جنونی بادشاہ کارلوس دوم نے دربارِ عام لگا کر ڈیڑھ سو سے زائد "کافروں" کو اذیتیں دے کر مروایا تھا۔ اسی دروازے کے عقب میں درجنوں چھوٹے چھوٹے بازار اور تنگ گلیاں ہیں جنہیں قدامت کی وجہ سے میڈرڈ کا خوبصورت ترین علاقہ شمار کیا جاتا ہے۔ بانکو نے انہی گلیوں میں سے ایک ایسا ریستوران دریافت کیا تھا جہاں بقول اُس کے دنیا کا ارزاں ترین ڈنر دستیاب ہوتا ہے۔ ٹھنڈا سوپ، مچھلی، تورتلا یعنی آملیٹ، سویٹ ڈش، کافی اور ان سب کو ہضم کرنے کے لیے

سُرخ شراب صرف پچیس پیسیتے!

ایک مرتبہ جنوبی فرانس کے انگوروں کے باغوں میں سرِ شام جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلے پہل کسی انگور کے خوشے میں سے ایک آدھ جھینگر کے بولنے کی آواز بلند ہوئی۔ پھر وقفے کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میل ڈیڑھ میل تک پھیلے ہوئے باغات ان کے شور سے گونجنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بات کرنی بھی مشکل ہو گئی۔ رات کے تین بجے جب میں بانکو کے تجویز کردہ ریستوران میں کھانا کھانے کے بعد کاساڈے کامپو کے گھنے درختوں میں سے گزر رہا تھا تو یہاں بھی ہر سُو جھینگروں کا شور تھا۔ البتہ ہسپانوی جھینگر اپنے فرانسیسی بھائی بندوں کی نسبت زیادہ مضبوط پھیپھڑوں کے مالک واقع ہوئے تھے۔

یہ جنگل ایک زمانے میں شہر سے خاصے فاصلے پر تھا مگر بعد میں میڈرڈ کی پھیلتی ہوئی آبادی نے اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُن دنوں یہ صرف شاہی خاندان کے افراد کے لیے مخصوص تھا اور بطور شکار گاہ استعمال کیا جاتا تھا۔ شکار اب بھی ہوتا ہے مگر شکاری شہزادوں کی بجائے ہسپانوی نوجوان ہوتے ہیں اور شکار جانوروں کا نہیں متناسب جسم کی مالک اُن جرمن اور سویڈش لڑکیوں کا کیا جاتا تھا جو شام ڈھلے جنگل کے مختلف حصوں میں واقع قہوہ خانوں میں بیٹھی آنکھیں جھپکتی ملتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک قہوہ خانہ ہوسٹل کے رستے میں بھی پڑتا تھا۔ جہاں اس وقت بانکو سمیت ہوسٹل کے تمام مکین ہڑبونگ مچا رہے تھے۔ سویڈش لڑکیاں وافر تعداد میں۔ سُرخ شراب مشکوں کے حساب سے اور موسیقی ہوسٹل والے ہپی لڑکے کی گٹار میں سے اُبلتی ہوئی۔ ایک غیر ملکی لڑکی ایڑیوں میں کاسترنات پروئے میز پر کھڑی بولیرو رقص ناچنے کی کوشش میں۔ بانس کے ساتھ بندھے رستے سے جھولتے ہوئے رنگ برنگے قمقمے۔ میں پاس سے گزرا تو بانکو نے مجھے بھی دبوچ لیا۔

"ہائے ہائے کیا کر رہے ہو! میڈرڈ میں رات کے تین بجے بھی کوئی سوتا ہے۔"

میرے لیے "ہورشاتا ڈی شوفا" منگوایا گیا۔ ناریل ملا دودھ قسم کا مشروب ماہیٔ "سردائی" جیسا ذائقہ تھا۔ گلاس ختم کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جیسے کاسانفے کامپو کے جھینگر نری ٹرٹر نہیں کر رہے باقاعدہ چائے کوسکی کی سمفنی بجا رہے ہیں۔ گٹار کی لَے ہے کہ دل اُترتی ہی چلی جا رہی ہے۔ جنگل میں سرسراتی ہوا کچھ زیادہ ہی خوشگوار ہے اور میز پر ناچنے والی لڑکی جو پہلی نظر میں بس یونہی سی لگی تھی اب بہت ہی خوبصورت ہو چلی ہے۔ دوسرے روز معلوم ہُوا کہ بانکو نے ویٹر کے ساتھ سازباز کر کے ہورشاتا میں برانڈی کی آمیزش کر دی تھی، تبھی!

صبح سات بجے ہوسٹل واپسی پر ابھی ہم بستروں میں ٹانگیں اور بازو پھیلا کر سونے کے لیے مناسب پوزیشن کی جستجو میں تھے کہ دروازہ کھُلا اور وارڈن صاحب حسبِ معمول بندوق تھامے وارد ہو گئے۔ "حضرات صبح کے سات بج چکے ہیں۔ اُمید ہے آپ رات مزے سے سوئے ہوں گے۔ اب آپ اچھے سیاحوں کی مانند تیار ہو کر میڈرڈ کی سیر کو نکل جائیے۔ صبح بخیر۔" وارڈن نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو ایک مرتبہ پھر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ سگرٹوں میں سے تمباکو جھاڑ کر اُن میں چرس ملائی گئی۔ کش لگے۔ تھوڑی دیر بعد قبرستان میانی صاحب .... ہر سُو مکمل خاموشی!

میں نے سفید ہورشاتا کا ایک گھونٹ پیا۔ میز پر بکھرے گھر سے آئے ہوئے خطوط پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جنہیں میں تین مرتبہ پڑھ چکا تھا اور پھر سر کھجلانے لگا۔ اب کیا کیا جائے۔

آج میڈرڈ میں قیام کا چوتھا روز تھا۔ پہلے دو روز تو ہوسٹل کی روایات کے مطابق گزرے یعنی دن بھر پڑے اُونگھنا اور پھر کاسا دے کامپو کے

قہوہ خانے میں رت جگا۔ تیسرے روز فہرست بنا کر میڈرڈ کے تمام قابلِ دید (؟) مقامات کو بھگتایا اور آج صبح کا لے دسے الکالے پر واقع سفری اوارے تھامس کُک سے پاکستان کی ڈاک وصول کر کے اب میں پچھلے دو گھنٹوں سے پلازا ویل نیپچونا کے ایک قہوہ خانے کے باہر ہورشاتا کا تیسرا گلاس سامنے رکھے سر کھجلانے میں مصروف تھا۔ یہاں میری طرح کے سینکڑوں نکمے لوگ قطار اندر قطار منہ اُٹھائے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے جنہیں زندگی میں اور بھی بہت سے کام تھے۔ مثلاً کسی اور قہوہ خانے میں جا کر بیٹھنا اور پھر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنا جنہیں........ فٹ پاتھ کے ایک سرے پر لاہور کی بیڈن روڈ کی طرح درجنوں بوٹ پالش کرنے والے بیٹھے تھے۔ البتہ یہ حضرات بُرش سٹینڈ پر کھٹکھٹا کر "خُو لوٹ پالیش" کے نعرے بلند کرنے کی بجائے اخبار سامنے پھیلائے پچھلی بُل فائٹ کی تفصیلات پڑھنے میں مگن تھے۔ اگر کوئی صاحب اُن کی بےخبری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سٹینڈ پر اپنا بُوٹ جما دیتے تو وہ شکایت بھری نظروں سے یوں دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں، "بھلے آدمی بُل فائٹر آل کو روبس پچھلے اتوار بارسلونا کے اکھاڑے میں مرتے مرتے بچا ہے اور تمہیں بُوٹ پالش کروانے کی پڑی ہے۔" بہرحال وہ دوچار مرتبہ بڑی بےدلی سے بُرش چلا کر انہیں فارغ کر دیتے اور پھر باچھیں پھیلا کر مطالعہ میں محو ہو جاتے۔ ان کے ساتھ دو بوڑھے ہسپانیہ کی مشہور نیشنل لاٹری کے کوپن گلے میں لٹکائے "لاٹری کوپن" کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ہمارے ہاں کی طرح ایک عام ہسپانوی کی ہزاروں خواہشیں ایسی نہیں ہوتیں جن پر اس کا دم نکلتا ہے۔ ان کی تعداد صرف چار ہوتی ہے (۱) بُل فائٹر بننا (۲) جرمنی میں ملازمت کرنا (۳) کسی سویڈش دوشیزہ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لانا (۴) نیشنل لاٹری جیتنا۔ خواہش نمبر تین ہر ہسپانوی کی باآسانی پوری ہو جاتی

ہے بلکہ اتنی مرتبہ پوری ہوتی ہے کہ واقعی دم نکلنے کو آتا ہے۔ جرمنی میں چونکہ پہلے سے ہی لاتعداد ہسپانوی موجود ہیں اس لیے وہاں ملازمت کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ بل فائٹر بننا اور کروڑوں پیسیتے کی نیشنل لاٹری جیتنا ایسے ارمان ہیں جو کم ہی نکلتے ہیں۔ ان دنوں ایک چھوٹے سے قصبے کی بڑی دھوم تھی جس کے باشندے کئی برسوں سے اجتماعی طور پر نیشنل لاٹری کے کوپن خریدتے تھے اور بالآخر اس ماہ کروڑوں پیسیتے کی نیشنل لاٹری ان کے نام نکل آئی تھی۔ وہاں کے تمام مردوں نے کام سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اب سارا دن مقامی قہوہ خانے میں بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔

میڈرڈ کے بارے میں ٹونی کے تاثرات سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے۔ بے جان اور ڈل سا شہر۔ پچھلے چار روز سے میرے جیسے ٹھرکی شخص کے سامنے ایک بھی ایسی عمارت نہیں آئی تھی جسے دیکھ کر کیمرے کا بٹن دبانے کو جی چاہے۔ کسی شہر کے بے جان ہونے کے حق میں اس سے زیادہ مثبت دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اپنے عالیجناب میر دبیر قاضی ولی محمد صاحب بھی میڈرڈ آئے۔ "سفر نامۂ اندلس" میں لکھتے ہیں:-

"جدید شہر کے ہوا دار ہفت منزل محلات۔ کشادہ شوارع۔ پُر فضا باغات۔ نکہت افزا چمن۔ پیرس و فرانکفورٹ یاد دلاتے ہیں۔ پٹڑیوں پر قہوہ خانے سجے ہوئے ہیں۔ صہبائے جلیقیہ و شریش کا دور چل رہا ہے۔ برف کی بھرمار ہے۔ برقی پنکھے کے علاوہ خوش وضع مشک پنکھیہ کو نازک کلائیاں ایک خاص اندازِ دلربائی سے چلا رہی ہیں۔"

قاضی صاحب نے قدیم شہر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں:-

"بجز سوز بام و مساکین کے اس کی تنگ، پیچیدہ اور متعفن گلی کوچوں

میں اور کوئی بھلا آدمی نہیں رہتا۔ شکستہ سڑک پر ٹاٹ بچھا ہوا ہے جس پر سامان بساط خانہ کے پاس فربہ اندام اندلسی خاتون مانگ پٹی سے آراستہ برہنہ سر، ہاتھ میں پنکھا لیے ایک مونڈھے پر بیٹھی گاہکوں کا منہ تک رہی ہے۔ میوہ فروش کیاڑن خربوزوں کی ڈھیری پر اسی بے تکلفی سے بیٹھی ہے جس طرح پیداوار نباس پر لنک کی غیور پٹھانی پیشواز پہنے متمکن ہو۔ بلنشیہ کی کھادی اور مالقہ کی اوڑھنیاں ایک طرف فروخت ہو رہی ہیں۔ طلیطلہ کے چاقو دوسری طرف جمع ہیں۔ ایک سافن دو پیسے کے معاوضہ میں آبِ زلال کا ایک جرعہ پیش کر رہی ہے۔ تمباکو فروش ایک ایک پیسے کے تلخ گوکوز سگرٹ فروخت کر رہا ہے۔ خچر کھانچیوں کے پاس کھڑے ہیں۔"

میں نے ہورشاتا کا چوتھا گلاس منگوایا اور چوک میں ایستادہ سروانتیس میموریل کے کالونی کے مجسموں کا جائزہ لینے لگا۔ روزی نانتے پر سوار بارشیش ڈوان کے خوتے ہاتھ میں نیزہ تھامے اور اس کا وفادار ساتھی سانچو پانزا خچر ہانکتا ہوا۔

"معاف کیجیے گا شاید میری پنسل آپ کی میز کے نیچے گر گئی ہے۔"

میں نے سانچو پانزا کے آہنی خدوخال سے نظریں ہٹا کر امریکی لہجہ کی اس "معاف کیجیے گا" کی جانب دیکھا۔ درمیانی عمر کی ایک قدرے قبول صورت خاتون ساتھ والی میز پر کہنیاں ٹیکے میری جانب نہایت معصومیت سے ٹک ٹک تکے جا رہی تھیں۔ میڈرڈ کی طرح جدید، بے جان اور ڈل سا چہرہ۔ مجھ جیسے شرفا کو پنسل گرا کر متوجہ کرنے کے طریقۂ کار سے میں بخوبی واقف تھا۔ بہرحال میں نے پنسل اٹھا کر انھیں تھما دی۔

"بہت بہت شکریہ۔" انھوں نے نہایت بھولپن سے مسکرا کر کہا۔

"یو آر ویلکم" میں نے حسب آداب تکلف برتا۔

"اوہ......" اس کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ تو انگریزی بھی جانتے ہیں۔"

"جی!"

"بہت خوب! مجھے تو میڈرڈ سے پیار ہو گیا ہے اور آپ کو؟"

"نہیں ہوا۔"

"او ہو...... آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا؟"

"الترو۔ پلازا دیل سول دیکھ لیا ہے...... اور یہ پلازا دیل نیپ چونا اب دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا؟" ان پر خود ساختہ سکتہ طاری ہو گیا۔ "یعنی آپ نے ابھی تک پراڈو نہیں دیکھا؟ یا خدا۔ وہ دیکھیے سامنے ہی تو نظر آ رہا ہے۔ وہ جس کی عمارت کے سامنے گویا کا مجسمہ نظر آ رہا ہے۔"

"گویا کہ......"

"نہیں نہیں گویا کہ نہیں گویا۔ مشہور ہسپانوی مصور......"

"جس نے ڈچس آف ماجا کی برہنہ تصویر بنائی تھی......"

"اوہ! یہ تو شرارت ہے۔" انھوں نے انتہائی مسرت سے اعلان کر دیا۔ یہ آخری فقرہ قطعی طور پر خطرے کا الارم تھا۔ چنانچہ میں نے بقیہ ہورشاتا ایک ہی سانس میں ختم کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے اس وقت ٹورسٹ آفس سے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں اس لیے اجازت دیجیے۔"

"اوہ......" اُنھوں نے فوراً اپنا ٹوکری نما پرس اُٹھایا اور کھڑی ہو گئیں۔ "مجھے بھی اس وقت ٹورسٹ آفس سے......"

ٹورسٹ آفس میں میں نے کاؤنٹر پر رکھا ایک کتابچہ اُٹھایا اور باہر نکل آیا۔ ان محترمہ نے بھی وہی کتابچہ اُٹھایا اور میرے ساتھ ہی چپکی چلی آئیں۔

"اب ہم کیا کریں؟" محترمہ نے "ہم" پر یوں زور دیا جیسے ہم ایک مدت سے ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا چلے آ رہے ہیں۔

"میں سونا چاہتا ہوں۔" میڈرڈ کی گرم دوپہر اور محترمہ کے بے جا التفات سے بچاؤ کا واحد طریقہ ہوسٹل واپس جا کر آرام کرنا تھا۔

"اوہ! پھر شرارت۔ تم یقیناً اپنا وقت ضائع کرنے میں یقین نہیں رکھتے۔" انھوں نے ایک گہری سانس لے کر پیار سے کہا۔ "لیکن اس وقت...... پراڈو چلتے ہیں۔"

ہسپانیہ کے شاہی خاندانوں کو شاید فنِ مصوری کا اتنا شوق نہ تھا جتنا اپنی ذاتی تصاویر بنوانے کا چاؤ تھا۔ چنانچہ پراڈو آرٹ گیلری کی دیواروں سے موٹے بادشاہ، بدہیئت شہزادیاں اور پستہ قد شہزادے آپ کو حقارت سے گھورتے نظر آتے ہیں۔ کارلوس پنجم، فلپ دوم اور فلپ چہارم کی تصاویر کی تو اتنی بہتات ہے کہ آنکھیں دُکھنے کو آتی ہیں۔ پراڈو دُنیا کی دوسری آرٹ گیلریوں سے یوں ممتاز ہے کہ اس میں آویزاں تمام شاہکار یا تو نقد رقم ادا کر کے حاصل کیے گئے اور یا پھر تیتیان، ولاسکز، اور روبنز جیسے شہرۂ آفاق مصوروں کو ٹھیکے دے کر سینکڑوں کی تعداد میں بنوائے گئے۔ نپولین کی طرح نہیں کہ یورپ فتح کرنے کے بعد ہر شاہکار تصویر پر "لوور" کا ٹھپہ لگایا اور پیرس روانہ کر دی۔ جہاں اس فن پرستی سے بہت سے مصوروں کا بھلا ہوا وہاں ہسپانوی بادشاہ بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ فلپ دوم نے ولاسکز سے ایک بڑھیا قسم کی تصویر بنا کر ولایت روانہ کی جسے دیکھ کر ایک اڑتیس سالہ نوخیز شہزادی اس بری طرح فریفتہ ہوئی کہ جہیز سے بھرے ہوئے جہاز میں سوار ہو کر خود شادی کرنے

ہسپانیہ آپہنچی۔ تیتیان، ولاسکز اور روبنز کے علاوہ پراڈو میں مریّو، ربیرا اور گویا کی تصاویر بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ روبنز نے متناسب جسم کی تصاویر بنائی ہیں اور حسب عادت ننگی بنائی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دودھیا سنگ مرمر نرم ہو کر جسمانی ابھاروں اور پیچ و خم میں ڈھل گیا ہے۔ گویا کی بنائی ہوئی سیاہی مائل "بلیک گویا" سیریز کی چودہ تصویریں جنگ کی ہولناکیوں کے خلاف ایک مصوّر کا احتجاج ہیں۔

ہم پراڈو کے کمرہ نمبر ۱۲ میں گئے جو صرف ولاسکز کے لیے مخصوص ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر اس کمرے میں آویزاں تصاویر کو نیلام کیا جائے تو بارہ ارب روپے سے زائد رقم حاصل ہو سکتی ہے۔

باہر نکلنے سے پیشتر گویا کی "دو ماجا" نامی تصاویر بھی سامنے آئیں۔ ایک میں ڈچیس آف ماجا شریف زادیوں کی طرح نیم ڈھکی چھپی صوفے پر نیم دراز۔ دوسری اسی حالت میں مگر بالکل برہنہ۔ ناقدینِ فن آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ ہر دو تصاویر میں سے کونسی کینوس پر پہلے اُتری۔ حالانکہ ظاہر ہے برہنہ تصویر بعد میں ہی بنائی جا سکتی ہے۔

ہم پراڈو سے باہر آئے تو ملحقہ باغ میں بلند ستون پر آویزاں گویا کا مجسمہ دیکھ کر محترمہ پھر جذباتی ہو گئیں "اوہ گویا......

گویاکہ۔"

"یہ تم گویا کو ہمیشہ گویاکہ کیوں کہتے ہو؟"

"ہمارے ہاں اسے گویاکہ ہی کہتے ہیں۔"

"اور اب ہم راسترو کی مارکیٹ میں چلیں گے۔" انھوں نے نہایت بے تکلفی سے اپنا ہاتھ میرے کندھوں پر رکھتے ہوئے اعلان کیا۔

"اور اب ہم یعنی صرف میں واپس ہوسٹل جا رہا ہوں۔" میں نے ان کا ہاتھ بصد احترام نیچے کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے صبح قرطبہ جانے کے لیے سامان پیک کرنا ہے۔"

"اوہو! لیکن راسترو میں نوادرات ملتے ہیں۔" وہ گھبرا گئیں۔

"ایک دن کے لیے میں نے ضرورت سے زیادہ نوادرات دیکھ لیے ہیں اور ان میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے۔"

"اوہ...... لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمیں وہاں کسی کباڑیے کے سٹور میں سے آن رجن بھر گویا کی تصاویر میں سے ایک ہاتھ لگ جائے جو ۱۸۷۰ء میں پراڈو سے چوری ہو گئی تھیں۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"پھر؟" وہ کھل اُٹھیں۔

"پھر خدا حافظ مس...... کیا نام ہے آپ کا؟"

"مس جان ہاورڈ۔ آرٹ ٹیچر ان باسٹن ہائی۔ یو۔ ایس۔ اے۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"خدا حافظ مس ہاورڈ۔" میں نے جلدی سے کہا اور پھر چوروں کی طرح نظریں نیچی کیے تیزی سے چلتا ہوا پراڈو کے احاطے سے باہر آ گیا۔

مس ہاورڈ کے ساتھ میں میڈرڈ کو بھی خدا حافظ کہہ دینا چاہتا تھا اور اب میرا رُخ اتوچا سٹیشن کی جانب تھا جہاں قرطبہ جانے کے لیے پیشگی ٹکٹ ملتے تھے۔ ایڈورڈ ہٹن نے اپنی کتاب "ہسپانیہ کے شہر" میں لکھا ہے "میڈرڈ کی سڑکیں ناپختہ اور گندی ہیں۔ یہاں کے لوگ منہ پھٹ اور بدتمیز ہیں۔ آب و ہوا ہسپانیہ بھر میں بدترین۔ ایک ایسا شہر جس سے کوئی بھی پیار نہیں کر سکتا۔" ہٹن کے آخری فقرے سے میں کلی طور پر متفق ہوں۔ کم از کم میرے اور میڈرڈ کے درمیان کسی قسم کا تعلق پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ برسلز اور فرینکفورٹ کے ہمراہ میں نے میڈرڈ کو بھی یورپ کے ناپسندیدہ شہروں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔

قرطبہ - دُور افتادہ

ایک سفید چمکتا گھر۔ روشن صحن میں ایک سانولا لڑکا ہاتھ ہلاتا ہُوا۔ پست قد، زیتون کے چھدرے گرد آلود باغ۔ ڈھلوانوں پر سبزے کی ایک تہہ کی صورت بچھی انگوروں کی بیلیں۔ قدیم وضع کا ایک رہٹ جسے ایک تھل تھل کرتا بوڑھا بھینسا تھوتھنی جھکائے سُست روی سے کھینچ رہا تھا۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک سیاہ پوش پادری نے اپنا ہیٹ اُتار کر سر کھجلایا اور آنکھیں میچ کر ادھر دیکھنے لگا۔ ہریالی سے پرے ایک خشک ٹیلے پر کسی مُورش قلعے کے شکستہ در و دیوار دکھائی دیئے۔ رفتار کا ساتھ نہ دے سکے اور پیچھے رہ گئے۔ ایک اُجاڑ قصبے کی تنگ گلی میں سے نکلتا ہُوا گدھے پر سوار ایک افلاس زدہ بوڑھا۔ شاہراہ اندلس پر تربوزوں سے بھرا ایک ٹرک جو ایک عرصے سے اس الیکٹرک ائیرکنڈیشنڈ ٹرین کے پہلو بہ پہلو جھومتا چلا آ رہا تھا، گھڑ دوڑ کے کسی بدقسمت گھوڑے کی مانند آہستہ آہستہ پیچھے رہ گیا۔ فلیش کی تیز روشنی ایسی سفید دھوپ اندلس پر اُتری ہوئی تھی اور ائیرکنڈیشننگ کے باوجود کھڑکی کے دبیز شیشے میں سے اس کی حدت سرایت کرتی ہوئی میرے جسم کو چھو رہی تھی۔

"ٹِکٹ سنیور!" متحرک نظاروں کا تسلسل یکدم ٹوٹ گیا۔ چیکر میرے سامنے یوں ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا جیسے فوراً مجھ سے مصافحہ کر لینا چاہتا ہو۔

"سی۔ ہاں!" میں نے سر ہلایا اور پاسپورٹ میں سے ٹکٹ نکال کر اُسے تھما دیا۔

"میں قرطبہ جا رہا ہوں۔"

"قرطبہ؟" ٹکٹ چیکر نے بے یقینی کے عالم میں میری جانب غور سے دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کہہ دے گا۔ قرطبہ؟ کونسا قرطبہ؟ تم شاید تاریخ سے واقف نہیں۔ مُوروں کا شہر قرطبہ تو مٹ بھی چکا۔ وہ چلے گئے اور ان کا وجود بھی ختم ہو گیا۔ اب وہاں کھنڈر ہیں۔

"قرطبہ...... میڈرڈ سے ...... میل ...... ۷۵۴ پسیتے نقد......" میں نے اس کے ہاتھ سے ٹکٹ لے کر قرطبہ کی مہر پر انگلی جماتے ہوئے وضاحت کی۔

"آ با کوردوبا......" چیکر نے زور زور سے سر ہلایا اور اپنے موٹے جُثّے کے اندر ہی اندر ہنسنے لگا۔ اس کی توند میں پھنسی چمڑے کی کالی پیٹی پسٹن کی طرح آگے پیچھے چھک چھک چلنے لگی۔

"آ با کوردوبا" میں نے رعشہ زدہ پتلیوں کے مانند جو ابا سر ہلا کر اُس کی نقل اُتاری اور پھر قریب آ کر نہایت احترام سے کہا "کوردوبا نہیں۔ قرطبہ سنیور جی۔ قرطبہ...... قبۃ الاسلام و مجتمع اعلام الانام۔ ام القرٰے و قرارۃ اولے الفضل والتقے۔ ام البلاد...... قرطبہ!"

"پوتر مریم" چیکر نے فوراً اپنے سر سے ہیٹ اُتار کر سینے پر صلیب کا نشان کھینچا "مجھے مُوروں سے بچانا" اور بڑبڑاتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔

قرطبہ میرے لیے اب تک صرف تاریخ کی ضخیم کتابوں میں بکھرے اُن سحر انگیز ناموں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں یقین نہیں آتا کہ ان شہروں کا وجود کبھی تھا یا اب بھی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہرات، یارقند، سمرقند، اترار، بلخ، ختن، قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ ایسے نام صرف داستانوں کے لیے اختراع کیے گئے۔ اِن ناموں کے شہر تاریخ کے صفحوں پر اُن نخلستانوں کی طرح ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر جدید تہذیب میں جکڑے انسان کی آنکھ میں ٹھنڈک کے چشمے اُترتے ہیں

اور وُہ لمحہ بھر کے لیے اس دنیا کی جُوہوں کی دَوڑ سے الگ ہو کر سکون اور آشتی سے آشنا ہو جاتا ہے" ایکس پنڈیسیان الیکٹرونیکا" یعنی برقی ایکسپریس اتوچا سٹیشن میڈرڈ سے آج صبح دس بجے روانہ ہوئی تھی اور اسے پورے تین بجے قرطبہ پہنچ جانا تھا، وہ بجا چاہتے تھے اور گھڑی کی سوئیوں کا ایک اور دائرہ مکمل ہونے پر قرطبہ تاریخ کی قدیم کتابوں کے کِرم خوردہ صفحات سے نکل کر میرے سامنے ایک زندہ حقیقت کی صورت میں ظاہر ہونے کو تھا۔ میرے ذہن میں خوف کے ننھے منّے سنپولیے سر اُٹھا رہے تھے۔ کیا تاریخ کے صفحوں میں پنہاں یہ نخلستان پیاس کے اُس بھانبڑ کو بجھا سکے گا جو اوائل عمری سے لے کر اب تک اس شہر اور اس کی تاریخ نے میرے اندر مچا رکھا ہے؟ دس ہزار میل کی مسافت کی گرد جو میرے جسم پر جمی ہے کیا اس کے چشموں میں دُھل جائے گی؟......یا پھر یہ نخلستان ایک سراب نکلے گا...... چاہتیں منتشر ہو جائیں گی۔ پیاس کی شدت اور سفر کی دُھول سے اَٹے جسم میں اتنی سکت نہ رہے گی کہ وہ دوبارہ کسی نخلستان کی جانب رختِ سفر باندھے......میں نے جب ٹکٹ چیکر کو ان طویل القابات کی فہرست سنائی تھی جن سے تاریخ دانوں نے قرطبہ کو نوازا ہے تو اس نے سینے پر صلیب بنا کر کہا تھا "یو آ ترمریم۔ مجھے مُوروں سے بچانا" یہ کیسا خوف ہے جو مُوروں کی آخری سلطنت غرناطہ کے زوال کے ۵۰۰ برس بعد بھی ہسپانوی ذہن پر سوار ہے یا پھر یہ خوف اس لاشعور کو دبانے کی ایک شعوری کوشش ہے جو ہر لحظہ ذہن کے نہاں خانوں میں اُنھیں اپنی ذات کی نفی کرنے کے عمل سے روکتا ہے۔ تم اپنے آباؤ اجداد سے کیسے منہ موڑ سکتے ہو؟ تمھاری شریانوں میں عرب اور بربر خون ہمک رہا ہے۔ تمھارے بیشتر شہروں اور دریاؤں کے نام عربی میں ہیں۔ بولیرو کی تانوں کے ہمراہ گٹار کی سنگت نہ ہو تو اذان کی لَے لگتی ہے۔ تم کوئی کام شروع کرنے سے پیشتر او جالِلّٰہ کہتے ہو جو دراصل انشاءاللہ ہے۔ اور تو اور یاسمین کے

پھول ابھی تک خاسمین ہیں۔

"کاؤنٹ جُولین مجھے علم ہوا ہے کہ تمھاری افریقی ریاست سیوتا کے صحراؤں میں بیحد تُند خُو عقاب پائے جاتے ہیں۔ تم سیوتا واپسی پر مجھے شکار کے لیے چند عقاب روانہ کر دو۔"

"کاؤنٹ جُولین نے کچھ عرصہ پیشتر اپنی نوجوان بیٹی لذریق شاہِ ہسپانیہ کے محل میں آدابِ شاہی کی تعلیم و تربیت کی غرض سے بھیجی تھی۔ ایک روز دریائے تاجو کے کنارے جُولین کی بیٹی حمامِ زبرید میں غسل کر رہی تھی۔ لذریق نے اُسے دیکھا۔ شاہانہ مزاج کے مطابق چند لمحوں کے لیے یوں فدا ہوا کہ اس کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔ جُولین کو جو شاہِ ہسپانیہ کا باجگذار تھا، اپنی بیٹی کی عزت لُٹ جانے کا علم ہوا تو فوراً تولیدو آن پہنچا۔ شاہ کی فرمائش سُن کر جُولین نے مسکرا کر کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو افریقہ سے ایسے تُند خُو عقاب روانہ کروں گا جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گے۔"

اگلے سال ۷۱۱ء میں کاؤنٹ جُولین کی شکایت پر مسلمان تُند خُو عقابوں کی طرح ہسپانیہ پر جھپٹے اور چشم زدن میں اس کی فضاؤں پر چھا گئے۔ جُولین نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔

ویسے گبن لذریق کے ہاتھوں جُولین کی بیٹی فلوریڈا کے لُٹنے کی داستان کو فرضی قرار دیتا ہے اور اس کی تصدیق ابوالفدا سے ہوتی ہے جو لکھتا ہے "حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی عربوں کے جنگی جہاز ساحلِ اندلس پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہسپانویوں کو کارتیج کے محاصرے کے دوران میں مدد کی سزا دینا چاہتے تھے۔" بہرحال جُولین نے کسی ذاتی عداوت کی بناء پر افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر کو ہسپانیہ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ موسیٰ نے فضا

کو سازگار پایا مگر بھرپور حملے سے پیشتر خلیفہ ولید سے اجازت طلب کی۔ ولید نے پیغام بھیجا: "باقاعدہ حملے سے پہلے ایک چھوٹا سا دستہ اندلس روانہ کرو تاکہ ہمیں ہسپانویوں کی اصل قوت کا اندازہ ہو سکے۔ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو طوفانی سمندر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

عرب صحرانشین ہونے کے ناتے سے ہمیشہ سمندر سے خوف زدہ رہے اور یہ ترک ہی تھے جنھوں نے بعد میں یورپ کے اس مفروضے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا کہ تمام مسلمان سمندر سے خائف ہیں۔ ولید کے حکم کے مطابق موسیٰ نے ۷۱۰ء میں طریف نامی ایک آزاد غلام کو چار سو افریقی پیدل سپاہ اور ایک سو عرب گھڑسواروں کی کمان دے کر چار بحری جہازوں میں اندلس کی جانب روانہ کیا۔ طریف ساحل پر لنگرانداز ہوا اور اس کی مختصر فوج خشکی پر اٹھارہ میل اندر تک بلامقابلہ چلی گئی۔ ساحلِ اندلس پر آج بھی وہ مقام طاریف کہلاتا ہے جہاں تقریباً ساڑھے بارہ برس پہلے اس نام کے ایک آزاد غلام نے قدم رکھ کر مسلمان ہسپانیہ کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی۔ طریف کی انتہائی کامیاب مہم نے موسیٰ بن نصیر کو مطمئن کر دیا اور وہ اندلس پر ایک باقاعدہ اور بڑے حملے کا منصوبہ بنانے لگا۔ پورا سال طنجہ کی بندرگاہ میں اس مہم کے لیے جنگی جہاز بنتے رہے اور موسیٰ اپنے محل میں اندلس کا نقشہ سامنے پھیلائے جنگی منصوبہ بندی میں مگن رہا۔ اگلے سال کے موسمِ بہار میں موسیٰ کے سپہ سالار طارق بن زیاد نے پانچ ہزار سپاہ کی معیت میں افریقہ اور یورپ کے برِاعظموں کے درمیان حائل مختصر سمندری فاصلے کو جہازوں پر عبور کیا اس بے نام چٹان کے پہلو میں لنگرانداز ہوا جس نے بعد میں اس کا نام پایا اور جبل الطارق کہلائی۔ کہتے ہیں جب طارق کے جہاز طنجہ سے چلے تو ساحل پر کھڑے سینکڑوں بربر جوش میں آ کر سمندر میں کود پڑے اور تیرتے ہوئے جہازوں میں جا سوار ہوئے۔ تاریخ دان گبن ساحل اندلس پر جہازوں کے جلائے جانے والے واقع کے بارے میں شک کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس قسم کا بے مقصد اور سنسنی خیز فعل طارق ایسے باشعور جرنیل کے ہاتھوں ممکن نہیں۔ جونہی طارق خشکی کے اندر بڑھا، اردگرد کے چھوٹے حکمرانوں نے لذریق کو اطلاع کر دی۔ سب سے پہلے لذریق کا ایک نائب ایڈیکو مقابلے پر آیا مگر چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ایڈیکو کی شکست سے لذریق کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا اور وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنے ڈیوک، کاؤنٹ اور بشپ ہمراہ لیے ایک لاکھ فوج کی قیادت کرتا ہوا آگے بڑھا۔

آخری جنگ کے جائے وقوعہ کے بارے میں تاریخ دانوں میں اختلافِ رائے ہے۔ بیشتر عرب تاریخوں میں اسے وادی برباط میں جھیل لاجنڈا کے کنارے بتایا گیا ہے۔ لیکن گبن کہتا ہے کہ یہ جنگ قادس کے قصبے کے نواح میں شریش کے آس پاس لڑی گئی۔ اسی مقام پر طارق نے اپنی سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "میرے بھائیو! دشمن تمھارے سامنے ہے اور سمندر تمھارے عقب میں۔ کہاں جاؤ گے؟ اپنے قائد کے پیچھے چلے آؤ کیونکہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ یا تو جان دے دوں گا اور یا ہسپانویوں کو مسل کر رکھ دوں گا۔" قاضی ولی محمد نے اس تقریر کا حوالہ دیتے وقت "سمندر تمھارے عقب میں" کی بجائے "جھیل تمھارے عقب میں" لکھا ہے جس سے اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ جنگ جھیل لاجنڈا کے کنارے ہی لڑی گئی۔ تین دن تک فریقین میں چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہیں اور چوتھے روز ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ لذریق ہاتھی دانت کی بنی ہوئی رتھ پر سوار میدان میں آیا جسے دو سفید خچر کھینچ رہے تھے۔ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کے حملے میں اتنی شدت تھی کہ ہسپانویوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ موتیوں کی لڑیاں سر پر لپیٹے، ریشم کے سنہری لبادے میں ملبوس

لذریق یقیناً اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے تند خو صحرائی عقابوں کی خواہش کی تھی۔ جب شکست یقین کی سرحدوں کو چھونے لگی تو لذریق شاہی رتھ سے اُترا اور ریلیا نامی سفید گھوڑے پر سوار ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ بقول گبن وہ ایک بہادر کی موت مرنے کی بجائے وادی الکبیر کے پانیوں میں ڈوب مرا۔ ہسپانیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک غار میں گوشہ نشین ہو گیا اور باقی عمر عبادت میں گذار دی۔ پادری کہتے ہیں کہ "کافروں" سے شکست کھانے کی سزا میں اُسے خدا نے ناگوں سے رینگتے ہوئے ایک لمبے گڑھے میں ڈال دیا جہاں وہ چلا چلا کر فریاد کرتا تھا: "ناگنیں میرے جسم کے اس حصے کو تڑپ کر رہی ہیں جس کی مدد سے میں نے تمام تر گناہ کیے۔" اور ایک مسلمان تاریخ دان ابن اطہر نے لذریق کے انجام کے بارے میں لکھا ہے "گوتھوں کے بادشاہ لذریق کا سفید گھوڑا دلدل میں پھنسا کھڑا تھا۔ ہیروں سے جڑی کاٹھی پر لبادۂ شاہی رکھا تھا۔ کچھ فاصلے پر اس کا ایک جوتا اور ایک طلائی لباس پڑا تھا، وہ یا تو مارا گیا یا فرار ہو گیا۔"

لذریق سا پہاڑ راستے سے ہٹا تو طارق کو گویا پورا ہسپانیہ ایک وسیع میدان کی صورت نظر آیا جہاں کہیں کہیں شہری ریاستوں کے ٹیلے اُبھرتے تھے مگر بیشتر حصہ سپاٹ اور رکاوٹوں سے مبرا تھا۔ اس نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ آرکی ڈونا کی طرف۔ دوسرا البیرا العینی وادیٔ غرناطہ کی جانب۔ تیسرا مغیث رومی کی قیادت میں قرطبہ روانہ کیا گیا اور بقیہ فوج کے ہمراہ طارق خود تولیڈو کی طرف بڑھا۔

احتیاط پسند موسیٰ کو جب طارق کی مسلسل کامیابیوں کی خبریں موصول ہوئیں تو اُس نے اپنے جرنیل کو مزید پیش قدمی کرنے سے روک دیا۔ کچھ لوگ اس نامناسب حکم میں موسیٰ کا جذبۂ حسد پنہاں دیکھتے ہیں۔ اُدھر موسیٰ کے احکام کی خلاف ورزی

کرتے ہوئے طارق کی سپاہ نے اپنے گھوڑوں کی باگیں بدستور ڈھیلی چھوڑے رکھیں۔ یہاں تک کہ گرمیوں کے آخر نے انھیں ہسپانیہ کے دوسرے سرے پر واقع تولیڈو کی فصیلوں کے سائے تلے دیکھا۔ اس اثنا میں موسیٰ نے اپنے نافرمان جرنیل کا پیچھا کرنے کی ٹھانی اور جون ۷۱۲ء میں افریقہ کی گورنری اپنے سب سے بڑے بیٹے کو سونپ کر دس ہزار شامیوں اور آٹھ ہزار بربروں کی قیادت میں ہسپانیہ کے ساحل پر اُترا۔ طارق کے چھوڑے ہوئے شہروں قرمونہ اور اشبیلیہ کو روندتا گلیشیا اور لیون کے پہاڑوں کو عبور کرتا وہ تولیڈو پہنچا۔ اس نے طارق کو حکم عدولی کی بناء پر چابک سے پیٹا اور فی الفور معزول کر دیا۔ اب موسیٰ کا ارادہ تھا کہ وہ کوہ پیرانیز عبور کر کے اطالیہ، فرانس اور جرمنی کو زیر کرے، پھر ڈینیوب کے کنارے کنارے پیش قدمی کرتا ہوا بحیرۂ اسود تک جا پہنچے اور قسطنطنیہ ختم کرنے کے بعد سیدھا شام میں خلیفہ ولید کے دربار میں پیش ہو کر اپنی فتوحات کو ایک نیم دائرے پر محیط کر لے جس میں تقریباً پورا یورپ اور ایشیائے کوچک شامل تھا مگر طارق کے چند ساتھی دمشق پہنچ گئے اور اُنھوں نے اپنے سپہ سالار کی معزولی کو بنیاد بنا کر خلیفہ ولید کو موسیٰ کے خلاف بھڑکا دیا۔ لُوگا کے مقام پر خلیفہ کے قاصد نے موسیٰ کو جا لیا اور اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر واپسی کا حکم سنایا۔ موسیٰ یورپ فتح کرنے کی حسرت دل میں لیے واپس دمشق لوٹا مگر اس شان و شوکت کے ساتھ کہ اس کے گھوڑے کے پیچھے چار سو ہسپانوی شہزادے تاج پہنے چل رہے ہیں۔ شاہانہ لباس میں سینکڑوں شہزادیاں پالکیوں میں سوار ہیں اور چالیس ہزار سفید فام غلام مالِ غنیمت اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ یہ بے مثال جلوس فلسطین پہنچا تو ایک قاصد خلیفہ ولید کی شدید علالت کی خبر لے کر آیا۔ ساتھ ہی ولید کے بھائی سلیمان کا پیغام آیا کہ جلوس فلسطین میں ہی روک دیا جائے تاآنکہ ولید فوت ہو جائے اور اس کی جگہ سلیمان تخت نشین ہو جائے۔ یوں سلیمان اس فاتحانہ جلوس کا استقبال

کرکے اندلس کی فتح کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔

اس نقطے پر موسیٰ کا مستقبل قابلیت سے دامن چھڑا کر قسمت کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اُس کے لیے فوراً رک جانا یا دمشق کی طرف بڑھنا یکساں پُر از خطر تھا۔ رُکنے کی صورت میں ولید خلافِ توقع صحت مند ہو جائے تو سازش کا جرم اور اگر بدستور دمشق کی جانب گامزن رہے تو ولید کی موت کی صورت میں نئے خلیفہ سلیمان کے قہر کا سامنا۔ موسیٰ نے حال کی حکمرانی پر بھروسہ کیا اور رُکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ فروری ۷۱۵ء میں فاتحِ اُندلس دمشق میں داخل ہُوا اور اس کا استقبال مسجدِ اُمیّہ کی وسیع عمارت میں کیا گیا۔ سینکڑوں تاجدارانِ یورپ سرنگوں ہو کر خلیفہ کے حضور آداب بجا لائے۔ کہتے ہیں اس موقع پر موسیٰ نے دوسرے مالِ غنیمت کے علاوہ خلیفہ کی خدمت میں وہ تاریخی میز بھی پیش کی جس کے بارے میں روایت ہے کہ اسے حضرت سلیمانؑ کے جنّوں نے تخلیق کیا تھا۔ اسی نسبت سے یہ سلیمانؑ کی میز کہلائی۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد رُومی اس میز کو یورپ لے آئے اور بعد ازاں یہ گوتھک بادشاہوں کے ہاتھ لگی۔ عاقبت سنوارنے کے لالچ میں یکے بعد دیگرے درجنوں بادشاہوں نے اسے جواہرات سے سجایا۔ مسلمانوں کے حملے کے وقت یہ میز تولیدو کے کلیسائے اعظم میں دھری تھی۔ طارق نے اُسے ایک فرار ہوتے ہوئے راہب سے چھینا تھا جس نے یہ میز اپنے لبادے میں چھپا رکھی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس کے تین سو ساٹھ پائے تھے اور جس وقت موسیٰ نے اُسے خلیفہ کے حضور پیش کیا تو ان میں سے ایک موجود نہ تھا۔ طارق نے اس موقع پر آگے بڑھ کر وہ ایک پایہ اپنے لباس میں سے نکال کر میز پر رکھ دیا اور یوں ثابت کر دیا کہ اندلس کا اصل فاتح وہ ہے نہ کہ موسیٰ بن نصیر۔ خلیفہ نے جب اندلس کے اتنی آسانی سے فتح ہو جانے کا سبب دریافت کیا تو موسیٰ نے جواب دیا "وہاں کے شہزادوں کی نامردی"۔ لیکن یہ جواب اس نے خلیفہ ولید کو نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اس

کی جگہ اب خلیفہ سلیمان تخت نشین تھا۔ موسیٰ کا شاندار استقبال اس بات کی ہرگز دلیل نہ تھا کہ سلیمان اس کی حکم عدولی بھلا بیٹھا ہے بلکہ اس نے تو صرف اب تک بوڑھے موسیٰ کو اس تاریخی کھیل میں مرکزی کردار ادا کرنے کی اجازت دی جب تک کہ فتحِ اندلس کی شہرت اس کے نام منتقل ہو کر تاریخ کے صفحوں پر نہ اُتر گئی۔ یہ کھیل ختم ہُوا تو اسے موجودہ حکومت کی حکم عدولی کے الزام میں عدالت میں پیش کیا گیا۔ دو لاکھ درہم جرمانے کے علاوہ تمام جائیداد چھین لی گئی۔ کل مراعات سے محروم کر دیا گیا اور پھر برسرِ عام کوڑے لگانے کے بعد شاہی محل کے باہر تپتی دھوپ میں ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ جرم تھا "دروغ گوئی اور انا"۔ آتشِ فردو تو ایک معجزے سے سرد ہو گئی مگر اس کے بعد مطلق العنان حکمرانوں کی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے شاید خدا کے پاس بھی کوئی معجزہ باقی نہیں رہا۔ سلیمان بھی آدھی دنیا کا حکمران تھا۔ وہ مہندی سے سرخ کی ہوئی لمبی داڑھی والے عمر رسیدہ موسیٰ کو ذلّت کے عمیق گڑھوں میں دھکیلنے کے باوجود مطمئن نہ ہُوا۔ اور اس نے اشبیلیہ کے گورنر موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کو قرطبہ میں تہِ تیغ کروا دیا۔ جلاد نے عبدالعزیز کا سر ایک طشتری میں سجا کر موسیٰ کے سامنے دکھا کر پوچھا "کیا تم ایک باغی کے خدوخال پہچان رہے ہو؟"

موسیٰ نے جواب دیا "میں صرف اپنے بیٹے کے خدوخال پہچان رہا ہوں۔"

بالآخر موسیٰ کا بڑھاپا اور اس کی محرومی نصیبی اُسے بادشاہوں کے غیظ و غضب سے بلندلے گئے اور وہ چند برس بعد مکّہ میں فوت ہو گیا۔ تاریخ دان مقری نے لکھا ہے کہ آخری مرتبہ فاتحِ اندلس موسیٰ بن نصیر کو وادی القراء (حجاز) کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھیک مانگتے دیکھا گیا تھا۔

ایک اُجڑا اُجڑا باغ۔ بیچ میں ایک شکستہ فوّارہ جیسے صدیوں سے سُوکھا پڑا ہو۔

اینٹیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں، خشک رَوشیں، پژمردہ کیاریاں، پھول کملائے ہوئے، پتوں سے عاری ٹنڈ منڈ بیلوں کی شاخیں کسی لاغر کی پسلیوں کی مانند قدیم دیواروں سے چمٹی ہوئی۔ گاڑی آہستہ ہوتی جا رہی تھی۔ پھر نیلے آسمان کو ایک پلیٹ فارم کی ٹین کی چھت نے چھیدا اور ڈھانپ لیا۔ چھت سے ایک چھوٹا سا بورڈ جھولتا نظر آیا۔ "کارڈوبا"۔

قرطبہ! مُغیث رُومی نے انجیر کے ایک درخت پر چڑھ کر اپنا عمامہ فصیل پر پھینکا اور اس کی مدد سے شہر کے اندر کود گیا۔ پہلے مسلمان فاتح کی حیثیت سے۔ میں اپنا رَک سیک اُٹھا کر اس کے پلیٹ فارم پر اُترا۔ ایک سیاح کے طور پر! اس بزرگ شہر کا سٹیشن کالا شاہ کاکو سے بھی گیا گزرا تھا۔ کہیں یہ نخلستان سراب ہی نہ ہو؟ دل نے دھک سے دُہائی دی۔ میں دیر تک باہر جانے کے راستے سے منہ موڑے چھت سے ٹنگے بورڈ پر لکھے سات لفظوں کے مجموعی تاثر کو اپنی پیاسی آنکھوں میں سموتا رہا۔ "کارڈوبا"! یہاں تک کہ گاڑی کے ڈبے آپس میں بھڑے۔ حرکت میں آئے اور "کارڈوبا"۔ بورڈ کے نیچے سے سرکتے سرکتے پلیٹ فارم سے نکل گئے۔

یورپ میں ایک رسم بلائنڈ ڈیٹ نام کی ہے۔ آپ کے کسی دوست کی گرل فرینڈ آپ کو اکیلا پا کر (دوست بھی ساتھ ہوتا ہے) سر سے پاؤں تک آپ کا تفصیلی جائزہ لے کر سوچے گی "ان دنوں میری سہیلی اینجلا بھی بالکل بے کار ہے کیوں نہ ان دونوں کا تعارف کروا دیا جائے"۔ چنانچہ وہ اس کی خوبصورتی اور شُستہ مذاق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دے گی اور اسی انداز میں اپنی سہیلی کے سامنے آپ کی وجاہت کی داستانیں سنا کر اگلی مرتبہ اُس بی بی کو بھی ہمراہ لے آئے گی۔ ویسے یہ دوسری ترغیب سراسر رسمی ہوتی ہے۔ ورنہ فریقین اپنی اپنی صنف کے مطابق "سکرٹ میں ہو! کچھ بھی ہو! اور پتلون پہنے! کوئی بھی جاندار" کے مقولے پر یقین رکھتے ہیں۔ بہرحال اس اَن دیکھی بی بی کے ساتھ آپ کا تعارف کروا دیا جاتا ہے اور باقی معاملہ "ہمتِ مرداں یا سویڈش لڑکی کی صورت میں ہمتِ عورتاں" پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس انجانی ملاقات کا نام بلائنڈ ڈیٹ ہے۔ یعنی آنکھیں بند کر کے بحرِ رومان میں آنکھیں بند کر کے کود پڑنے کا نام۔ صرف کُودنے کے بعد ہی پانی کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے...... کچھ اسی طور قرطبہ کے ساتھ بھی آج میری بلائنڈ ڈیٹ تھی۔ تاریخی کتابوں نے "میچ میکرز" کا فرض سر انجام دیتے ہوئے اُس کے حُسن کے تذکروں سے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ لیکن قابلِ فہم طور پر اس پہلی ملاقات کے موقع پر میرے دل میں کُھد بُد مچی تھی۔ میں سٹیشن سے باہر قدم رکھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ جانے یہ خاتون میری توقعات پر پوری اُترتی ہے یا مجھ غریب کو خواہ مخواہ پھانس لیا گیا ہے۔ میں نے بکنگ کلرک سے ٹورسٹ آفس کا پتہ دریافت کیا اور جھجکتا ہُوا پہلی ملاقات کے لیے سٹیشن سے باہر آ گیا۔

خاتون دے اگری کلتورا" نامی ایک خشک اور بے ربط باغ سے بائیں ہاتھ پر کا لیے جنرل ازمو کی سڑک تھی اور اس کے ساتھ کا لیے گراں کاپی تان کی شاہراہ شروع ہوتی تھی۔ وہی جدید دکانیں۔ جہازی ہوٹل۔ نیون سائن، ٹریفک سگنل، لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے بوڑھے۔ قرطبہ بھی میڈرڈ کا چھوٹا بھائی لگ رہا تھا۔ یہ تو وہی عام سا شہر ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا...... بلائنڈ ڈیٹ بالکل بلائنڈ تھی۔

ایک قہوہ خانے کے ویٹر سے ٹورسٹ آفس کا راستہ دریافت کیا تو وہ جھاڑن کاندھے پر ڈال کر میرے ساتھ ہو لیا۔ ٹورسٹ آفس بند تھا۔ شیشے کے دروازے کے اندر ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر کچھ ہندسے درج تھے۔ ویٹر نے نچلا جبڑا کھینچ کر منہ لمبا کیا اور کھلی ہتھیلی پر سر رکھ کر آنکھیں جھپکانے لگا یعنی بند ہے قیلولے کے لیے۔

مہربان ویٹر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں وہیں فٹ پاتھ پر اپنے رُک سیک سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور اپنی آنکھوں کے سامنے متحرک اجسام کا جائزہ لینے لگا۔ نیم درازی کی اس سطح سے سب سے پہلے شہر کے باشندوں خصوصاً خواتین کی ٹانگوں کی بناوٹ سامنے آتی ہے۔ پھر نظر اُوپر اُٹھتی ہے تو جسم کے بقیہ خطوط کا حجم آشکارا ہوتا ہے۔ قرطبین دوشیزاؤں پر زیتون کے تیل اور پائیلیا یعنی پلاؤ کے اثرات نمایاں تھے۔ پلنگ کے پایوں ایسی موٹی اور گھسی ٹانگیں، چھوٹے قد اور چشمِ غزال بھی کچھ اتنی عام نہ تھی کبھی میں دکانوں پر آویزاں بورڈ پڑھنے لگتا، مفہوم تو سمجھ میں نہ آتا البتہ ان کے نیچے کا رد و بار دیکھ کر عجیب سا سکون محسوس ہوتا۔ ٹورسٹ آفس کے پہلو میں ایک فٹ پاتھی قہوہ خانہ تھا جس کی ایک میز پر بیٹھا کوئی غیر ملکی جوڑا کافی کے ہر گھونٹ کے بعد یہ لازم سمجھتا کر لبوں کے ذریعے ایک دوسرے کے گالوں کا درجہ حرارت معلوم کیا جائے۔ ان کے سامنے دو موٹی قرطبنیں چہروں کے آگے ہسپانوی نیچے پھیلائے انھیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں صرف ان کی سُرمے سے بھری آنکھوں کے پھیلنے اور سُکڑنے سے اندازہ لگا لیتا کہ اب غیر ملکی جوڑا کافی پینے میں مشغول ہے یا صرف مشغول ہے۔ بعض اوقات ان کی آنکھیں مزید پھیلنے سے انکار کر دیتیں تو وہ جھٹ سے میز پر دھرا شراب کا گلاس اُٹھا کر حلق میں انڈیل لیتیں۔

"ہیلو" میں نے قہوہ خانے کے ویٹر کو پکارا جو پچھلے پندرہ منٹ سے ہاتھ میں ایک طشتری لیے میری طرح فٹ پاتھ پر سے گذرنے والی نسوانی مخلوق کو بنظرِ غور دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں میری جانب مڑ کر دیکھا تو میں نے آنکھ میچ کر اُسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر دیا۔

"سی سینیور!" ویٹر کو میرے لیول پر آنے کے لیے خاصا جھکنا پڑا۔

"ایک ہورشاتا ڈی شوفا"

"یہیں فٹ پاتھ پر؟" اُس نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"کیا حرج ہے؟" میں نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

ویٹر میری اس شانِ فقیری سے بے حد متاثر ہوا اور اپنی طشتری دَف کی مانند بجاتا ہوا قہوہ خانہ کے اندر سے ایک ہورشاتا لے آیا۔

"میں پیتے" اس نے گلاس مجھے تھمانے سے پیشتر طشتری میں رکھا بِل آگے کر دیا۔

ہورشاتا کے ناریل ملے دودھ کا ایک گھونٹ بھر کے میں پھر اہلِ قرطبہ کی جانب بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے جسموں کے زیریں حصّوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"سینیور کیا آپ میرا انتظار کر رہے ہیں؟" ایک خوش مزاج بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی منی سکرٹ کو گھٹنوں تک کھینچتی میرے پاس آ بیٹھی۔

"بلائنڈ ڈیٹ؟" میں نے سوچا۔ اللہ میاں جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور یہاں تو چشمِ غزال بھی عام تھی۔

"ہورشاتا پیجیے گا؟" میں نے خوش دلی سے دعوت دی۔

"نو" ہر دو چشمِ غزال بڑے تباہ کُن انداز میں جھپکیں۔ اس نے اپنی کہنیاں منی سکرٹ میں سے دھیرے دھیرے پھسلتے گھٹنوں پر جمائیں اور دودھیا باہوں نے ایک سفید فریم کی مانند اس کے خوبصورت چہرے کا احاطہ کر لیا۔

"ماما میا" میرے منہ سے بے اختیار ایک ایسا فقرہ ادا ہو گیا جو ایسا ہی خوبصورت چہرہ دیکھنے کے فوراً بعد اطالوی نوجوان مصنوعی طور پر بے ہوش ہو جانے سے قبل ہاتھ ہلا کر بولتا ہے۔ پنجابی میں اسے "ہائے نیں میں مر جاواں" کہہ لیجیے۔

"تو پھر اگر آپ کو فرصت ہو تو آج شام......" میں نے ملاقات کے لیے

تمہید باندھی ہی تھی کہ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور قدرے بے رُخی سے کہنے لگی "سینئر میں ٹورسٹ آفیسر ہوں۔ آپ کو آفس کے سامنے فٹ پاتھ پر یوں لیٹا دیکھ کر جان گئی تھی کہ میرا ہی انتظار کر رہے ہیں......... آئیے دفتر کے اندر چلتے ہیں۔"

چمکتی دوپہر میں میری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ چھپر اپنی جگہ موجود قائم و دائم تھا۔ اللہ میاں فی الحال اسے پھاڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

"مزکیتا کیتھڈرل صبح آٹھ بجے سے ڈیڑھ بجے تک اور پھر پانچ بجے سے ساڑھے سات بجے تک سیاحوں کے لیے کھلتا ہے۔" اس نے دفتر کا دروازہ کھولتے ہوئے اطلاع فراہم کی۔

"مزکیتا کیتھڈرل؟" میں رُک سیک گھسیٹتا اس کے پیچھے چلا آیا۔

"آپ مسجد قرطبہ کہہ لیں......... میں جانتی ہوں کہ اکثر مشرقی سیاح قرطبہ صرف اس مسجد کی خاطر آتے ہیں۔"

"مسجد کے علاوہ قرطبہ میں اور کون کون سی قابلِ دید تاریخی عمارتیں ہیں ——؟"

ڈان ژوان کا لبادہ اُتار کر میں نے ایک طرف رکھ دیا اور ایک مرتبہ پھر سیاح کے روپ میں آ گیا۔

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ قابلِ دید تاریخی عمارتوں سے تمہاری مراد صرف مُورش عمارتیں ہیں۔" میری سابقہ لیڈی نُو نے چند سیاحتی کتابچے کاؤنٹر سے اُٹھا کر میرے حوالے کر دیئے۔ "شہر سے باہر سیرا مورینو کے دامن میں مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات ہیں۔ وہاں بس نہیں جاتی ٹیکسی آنے جانے کے دو سو پسیتے لے گی۔ وادی الکبیر کی مُورش پن چکیاں اور رُومی پُل......... تمہارے لیے عرب پل القصر اور پُرانے حماموں کے کھنڈر۔ قدیم فصیل شہر کے دروازے اور عربوں کے زمانے کا قدیم قرطبہ خوبصورت ترین حصہ ہے۔"

"عربوں کے زمانے کا قرطبہ۔......... میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ نخلستان سے آنے

والی بادِ نسیم کا پہلا جھونکا۔ "یعنی یہ جو شاہراہِ و گراں کاپی تان اور کالیے جنرل ازمو وغیرہ ہیں تو یہ........."

"یہ تو جدید قرطبہ ہے......... اور کچھ؟"

"ہاں دو چار روز قیام کا ارادہ ہے۔ اگر عہدِ قدیم کی کوئی کارروان سرائے ابھی تک شہر میں موجود ہو تو اس کا پتہ بتلا دیجئے......... شرط یہ ہے کہ وہاں اونٹ باندھنے کا تسلی بخش انتظام ہونا چاہیے۔"

"اُونٹ؟" اس کی آنکھیں مزید پھیلیں اور گردن لمبی ہو گئی کیونکہ وہ تھوک نگلنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"ہاں ہاں اُونٹ سٹیشن پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔"

"یُو جوک؟" چشم غزال نے دبے دل سے پوچھا۔

"یس آئی جوک......... بہرحال چند روز کے لیے کسی سستی رہائش کا متلاشی ہوں۔"

"یو نُو" وہ یوں کھلکھلا کر ہنسی کہ میرے اندر کا سیاح ڈانواں ڈول ہوا اور ڈان ژوان اُسے دھوبی پٹڑا دے کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ "ماما میا" کے ممنوع الفاظ کی ادائیگی سے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی اور اس نے بے حد سرکاری انداز میں مجھے شہر کے متعدد پانسیان اور ہوٹلوں کے پتے بتانے شروع کر دیئے۔

"پانساں ال کانڈے......... پچاس پسیتے! ہوٹل ٹوریو ڈور......... ستر پسیتے!" وہ کسی ہوٹل یا پانسیان کا نام رجسٹر سے پڑھتی اور پھر گردن میں خم دے کر میری جانب یوں دیکھتی جیسے نکاح خواں منظوری کی اجازت چاہتا ہو۔ میں بلا سوچے سمجھے اسے مہنگا قرار دے کر انکار میں سر ہلا دیتا۔ اس پر چشم غزال اونہہ کر کے منہ کچھ یوں سکیڑتی کہ جیسے اس نے کوئی ایسی نتھ پہن رکھی ہے جو تنگ ہونے کی وجہ سے اُسے زبردست کھجلی کر رہی ہے۔ "ہوٹلوں کے کرائے گراں تو کجا دگر

یورپی شہروں کی نسبت بزبانِ انگریزی "ڈرٹ چیپ" تھے۔ مگر میں اس ڈان ژوان کا کیا کرتا جواب مکمل طور پر مجھ پر حاوی ہو چکا تھا اور جو دنیا و مافیہا سے بے خبر صرف اس کی ناک کے سکڑنے کا منتظر رہتا تھا۔ درجن بھر ہوٹلوں کے نام گنوانے کے بعد شاید اس نے میرے چہرے سے ہی میرے دل کا مضمون بھانپ لیا اور وصل کا رجسٹر بند کر کے بولی "آپ کے رُک سیک پر خیمہ بندھا ہُوا ہے۔ کیمپنگ میونسپل میں تشریف لے جائیے......... تیس پسیتے........" اور اس نے مزید گفت و شنید کے مواقع "خدا حافظ" کی مہر لگا کر مسدود کر دیئے۔ میں نے ایک نظر اس بھاری پتھر پر ڈالی جسے چوم کر میں رکھ نہ دیتا اور پھر رُک سیک کے بھاری پتھر کو اُٹھایا اور اُسے کاندھے پر ڈال کر باہر آ گیا۔

کیمپنگ میونسپل قرطبہ شہر سے دو میل کے فاصلے پر زیتون کے ایک باغ میں واقع ہے۔ دیگر سہولتوں کے علاوہ یہاں ایک نہایت شاندار نہانے کا تالاب بھی ہے۔ غسلِ جسمانی کو جی چاہے تو تالاب میں ڈبکی لگا لیجئے اور اگر صرف غسل آفتابی کے شوقین ہیں تو کنارے پر ایستادہ گھاس پھونس کی مخروطی جھونپڑیوں کے باہر لیٹ کر جسم سنولا لیجیے۔ غسلِ آفتابی قابلِ فہم طور پر میرے جیسے سانولے حضرات کے لیے کچھ اتنا مفید ثابت نہیں ہوتا۔ میں ایک کونے میں خیمہ نصب کرنے کے بعد ابھی اپنے عارضی گھر کی نوک پلک درست کر رہا تھا کہ خیمے کا پردہ سرکا اور ایک گھنگریالے بالوں والی گندمی رنگ کی چھوٹی سی بچّی نے اندر جھانکا۔

"السلام علیکم" اُس کے دُبلے پتلے جسم میں سے مجھے "ع" کی اتنی کھنکتی ہوئی ادائیگی کی اُمید نہ تھی۔

"وعلیکم السلام" میں نے بھی کسی دیہاتی مولوی کی طرح زبردستی "ع" حلق میں سے کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

اس نے ہنستے ہوئے کافی کا ایک پیالہ اور بسکٹوں کی ایک پلیٹ میرے سامنے رکھی اور پھر پردہ گرا دیا۔ میں سوچنے لگا، یا اللہ یہ میرے عرب بھائی تو مدتیں ہوئیں اس اُجڑے دیار سے کوچ کر گئے۔ یہ عربی بولنے والا ننھا فرشتہ کہاں سے ٹپک پڑا۔ مزید تحقیق کے لیے میں پیالا اور پلیٹ اُٹھا کر باہر آ گیا۔ میرے خیمے سے چند گز کے فاصلے پر وہ بچی گھاس پر آلتی پالتی مارے آئس کریم کھانے میں مشغول تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس دی اور ایک نزدیکی خیمے کے اندر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد خیمے کا پردہ اُٹھا اور اُسی ننھے فرشتے سے مُشابہ مغربی افریقی خد و خال کا حامل ایک نوجوان باہر آ گیا۔

"السلام علیکم مستنصر" اس نے نہایت گرمجوشی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر پلیٹ زمین پر رکھی اور ہاتھ ملایا۔

"میرا نام حسن ہے اور میں مراکشی ہوں۔ میری بچی زبیدہ کو کیمپنگ میں داخلے کے رجسٹر کے مطالعے کا بہت شوق ہے۔ ہم شام کی کافی پی رہے تھے کہ وہ دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی۔ ابا جان مستنصر نامی ایک پاکستانی ابھی ابھی کیمپنگ میں آیا ہے۔ میں اُسے دیکھ آؤں؟ اور پھر خود ہی کافی تیار کر کے آپ کے پاس لے گئی۔ آئیے خیمے کے اندر چلتے ہیں۔"

خیمے کے اندر حسن کی سادہ مگر خوش شکل بیوی اور سات بچے سلسلہ وار ایک قالین پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پورا خاندان اُٹھ کھڑا ہُوا اور حسن نے باری باری میرا سب سے تعارف کروایا۔ ہر ایک کے حلق میں سے وہی خصوصی "ع" والی السلام علیکم برآمد ہوئی۔ کافی سے فارغ ہو کر ہم دونوں ایک کونے میں جا بیٹھے اور حسن ملی جلی انگریزی اور عربی میں مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "میرا پیشہ وکالت ہے۔ ہم ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں جنوبی فرانس میں گزارتے ہیں۔ واپسی پر قرطبہ میں ٹھہرتا ہوں تاکہ میرے بچوں کو معلوم ہو کہ ہم

سے ایسے نہ تھے۔ یونانی فلسفہ، موسیقی، علمِ حساب، علمِ بدن اور دیگر بے شمار علوم ہمیں نے یورپ کو عطا کیے اور پھر میں سال میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز مسجد قرطبہ میں ضرور ادا کرتا ہوں۔"

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں۔"

"قانونی طور پر شاید نہ ہو مگر مجھے تو پچھلے دس برس سے کسی نے نہیں روکا۔ اور پھر ہسپانوی حکومت بھی تو اسے مزکیتا کیتھڈرل یعنی مسجد کلیسا کا نام دیتی ہے۔ اگر کلیسا میں عبادت ہو سکتی ہے تو مسجد میں نماز پڑھنے پر کیسے پابندی عاید کی جا سکتی ہے۔"

کتنی عجیب بات ہے کہ جس ملک پر عربوں نے پونے آٹھ سو برس حکومت کی آج وہاں......"

"نہیں...... تم بھولتے ہو مستنصر" حسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں تو ان متعصب مُلّاؤں کی طرح بات نہیں کرنی چاہیے جو منبر پر چڑھ کر بڑی رعونت سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے اتنے سو برس اندلس پر حکومت کی اور اندلس ہماری جاگیر تھا...... نہیں ایسا ہرگز نہیں تھا، ہم نے یہاں کبھی بھی حکومت نہیں کی اس لیے کہ ہم تو خود یہاں کے رہنے والے تھے۔ یہ ملک ہمارا تھا۔ بھلا اپنے آپ پر بھی کوئی حکومت کرتا ہے؟ عربوں کی آمد کے ایک سو برس کے اندر اندر باہمی میل جول اور شادیوں کے نتیجے میں پورے ہسپانیہ میں ایک ایسی نسل وجود میں آئی جن کی رگوں میں یورپی، عرب اور افریقی خون دوڑ رہا تھا اور یہ سب کے سب مسلمان تھے ـــــ اندلسی مسلمان ـــــ اسی مخلوط نسل نے اندلس پر حکومت کی۔ ایک دور تو ایسا آیا کہ بیشتر خلیفوں کے بال اور داڑھیاں سنہری رنگ کے تھے اور عرب دکھائی دینے کے شوق میں انھیں خضاب سے سیاہ کرتے تھے۔ خلیفہ الناصر نے ایک مرتبہ جب شجرۂ نسب دیکھ کر اپنے جسم میں آباؤ اجداد کے خون کا تناسب جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ اُس کی رگوں میں صرف ایک فیصد عرب خون کی آمیزش ہے اور بقیہ ننانوے فیصد مخلوط ہے چنانچہ جب شمال کے عیسائیوں نے مسلمان اندلس کا پہلا شہر فتح کیا تو ان کی اُمیدوں کے برعکس اندلسی مسلمان عرب یا بربر نژاد نہ تھے بلکہ مسجدوں میں نماز ادا کرنے والوں کی صفوں میں اُنھی جیسے سُرخ و سفید سُنہری بالوں والے یورپی کھڑے تھے۔"

حسن اگرچہ پیشے کے لحاظ سے وکیل تھا مگر اندلس کے بارے میں اُس کی تاریخی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

"اور پھر اُس عہد کا مسلمان معاشرہ آج کے بے جا تعصب سے یکسر عاری تھا۔" حسن کہہ رہا تھا "مسلمان ہسپانیہ مذہبی رواداری اور ترقی پسند ثقافتی قدروں کا ایک ایسا روشن باب تھا جس کے بارے میں ہم لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ یہ ایک متعصب اور تنگ نظر عہد نہ تھا بلکہ ایک ایسا روشن خیال اور وسیع النظر معاشرہ تھا جس میں عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل تھے۔ پردے کا رواج نہ تھا۔ ہزاروں عورتیں کتابت اور غزل گوئی کے فن سے آشنا تھیں۔ اندلس کی سب سے بڑی شاعرہ ولیدہ کو ہسپانیہ کی صوفو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فنِ موسیقی پر عبور رکھنے والے کو ایک عالم گردانا جاتا تھا۔ فلسفے کی ترویج میں مذہب آڑے نہیں آتا تھا کہ ابنِ رُشد کے بقول افلاطون بھی درست کہتا ہے اور قرآن کے الفاظ بھی آخری سچائی ہیں۔ مذہبی رواداری کا عالم یہ تھا، کہ یہودی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اندلس کی عظمت کے کئی ستون یہودی عالم اور مفکر تھے۔"

حسن کی بیوی اگرچہ انگریزی زبان سے ناواقف تھی مگر وہ نہایت محویت سے ہماری گفتگو سُن رہی تھی۔ ننھا فرشتہ سو چکا تھا اور دوسرے بچے قالین پر لیٹے اُونگھ رہے تھے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" حسن نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "شام کا کھانا ہمارے ساتھ تناول فرمائیے۔"

"دراصل میں چاہتا ہوں کہ فوراً شہر جا کر مسجد قرطبہ دیکھ لوں۔"

"مسجد تو اس وقت بند ہو چکی ہو گی۔" حسن نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔ "نو بج رہے ہیں، کل دیکھ لیجیے گا۔"

"کل شاید نہ آئے" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں آپ کی بے قراری سمجھ سکتا ہوں۔" حسن مسکرا کر بولا "لیکن میرا تجربہ ہے کہ کل ہمیشہ آجاتی ہے .... اگر آپ یہاں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے ہیں، تو آئیے سوئمنگ پول کی جانب چلتے ہیں۔ بچوں کو سُلانے کے بعد زبیدہ کھانا وہیں لے آئے گی۔"

کیمپنگ کے شاہانہ تالاب میں ایک باوقار اور لمبے سیاہ بالوں والی عورت بے حد متانت اور سنجیدگی سے تیر رہی تھی۔ اس کے بازو اتنی آہستگی سے پانی کو چھوتے کہ تالاب میں ایک خفیف سی لہر بھی نہ اُبھرتی۔ ذرہ بھر ارتعاش پیدا نہ ہوتا۔ پھونس کی جھونپڑی کے باہر ایک عمر رسیدہ خادمہ بازو پر ایک چوغہ لٹکائے اُس کی جانب انتہائی شفقت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ عورت تالاب سے باہر آگئی اور اپنے سنہری بدن کو چوغے میں لپیٹ کر تولیے سے بال سُکھاتی دوسری جانب چلی گئی۔ بوڑھی خادمہ جس کے ہاتھ میں ایک چرمی تھیلا تھا، اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اُس کی خوف زدہ آنکھیں یوں گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے وہ کسی پُرخطر جنگل میں تنہا ہو اور اس کے قدم اتنی احتیاط سے اُٹھ رہے تھے کہ جیسے گھاس میں سانپ رینگ رہے ہوں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے حسن کی جانب دیکھا۔ اُس کے سانولے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

قرطبہ - دُور افتادہ اور تنہا

جن دنوں غرناطہ کی شامیں موسیقار فالا کی دلنواز دُھنوں سے گونجتی تھیں ایک نوجوان شاعر ان دوستوں کی محفلوں میں اپنی ابتدائی نظمیں سُنایا کرتا تھا۔ فریڈیریکا گارسیا لورکا۔ اُس نے ویگا کی مانند ہسپانوی لوک گیتوں کو جدید شعری سانچوں میں انتہائی خوبصورتی سے ڈھالا۔ ۱۹۳۰ء کے پُر آشوب ہسپانیہ میں پرولتاریہ کے گیت گانے کے باوجود وہ عوام کے ہر طبقے میں یکساں طور پر مقبول تھا کہ لارکا کے لیے ایک خانہ بدوش، ایک خنجر اور ایک گھڑ سوار میں بھی اُتنا ہی شعری رُومان پنہاں تھا جتنا اُسے گارڈیا سول کی قہر انگیز طاقت میں دکھائی دیتا تھا۔ لورکا کی نظمیں اگرچہ نرم مزاج کی حامل ہیں لیکن یہ جذبات اس کے تن بدن میں سے یوں پھوٹتے ہیں جیسے اس کے خانہ بدوش کردار انتونیو کے جسم سے تیز دھار کے پانچ فوارے۔ مصوّر اور موسیقار ہونے کے ناطے سے اس کی شاعری میں سُوررلسٹ طرز کی پرچھائیاں ہیں۔ ہمیں اس کی بیشتر نظموں میں قسمت اور موت کے احساسات اُجاگر نظر آتے ہیں جس کی واضح مثال قرطبہ کی اُداس چاہت میں لکھی گئی نظم ہے۔

قرطبہ
دُور افتادہ اور تنہا!
میں ایک کالے خچر پر سوار ہوں
میرے تھیلے میں چند زیتون ہیں

اور آسمان پر پُورا چاند!
اگرچہ یہ راستے میرے جانے پہچانے ہیں مگر.......
میں کبھی بھی قرطبہ نہیں پہنچ پاؤں گا!
میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا
کالا خچر۔ سُرخ چاند!
موت مجھ پر نظریں جمائے دیکھ رہی ہے
قرطبہ کے میناروں سے۔
آہ! یہ طویل راستے۔
آہ! میرا بہادر خچر
آہ! انجام یہ کہ موت میری منتظر ہو
اس سے پیشتر کہ میں قرطبہ پہنچوں!
قرطبہ
دُور افتادہ اور تنہا!

لورکا کی المناک پیش گوئی پوری ہوئی۔ وہ قرطبہ نہ پہنچ سکا۔ موت اس پر نظریں جمائے دیکھ رہی تھی مگر قرطبہ کے میناروں سے نہیں غرناطہ کے بُرجوں سے' جہاں صرف اڑتیس سال کی عمر میں ہی اُسے فاشسٹوں نے ہلاک کر ڈالا۔ سوگواروں نے کہا "لورکا مر گیا۔ غرناطہ اب بغیر دل کے ہے"۔ قرطبہ لورکا کے لیے دُور افتادہ اور تنہا ہی رہا مگر میں آج میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا قرطبہ پہنچ گیا تھا۔

میں قرطبہ کے مرکزی چوک پلازا دے خوسے انتونیو کے دائیں کونے میں ایک بُلند محرابی دروازے سے آرکو دیل پورتلو کے تلے ایک ایسی بے نام سرحد پر کھڑا تھا' جہاں میرے پیچھے جدید عمارتوں، بھڑکیلے نیون سائنوں اور کشادہ شاہراہوں کا ایک ایسا پُرہجوم شہر آباد تھا جس سے میری شناسائی نہ تھی اور میرے سامنے ایک تنگ پتھریلی گلی ماضی کی عظمتوں میں خوابیدہ ایک ایسے شہر میں اُترتی تھی جو میرے لیے اَن دیکھا ہونے کے باوجود جانا پہچانا تھا۔ مجھے وہاں کسی راہبر کی ضرورت نہ تھی۔ میرے اندر کا قدیم انسان میری راہنمائی کے لیے جاگ اُٹھا تھا۔ محراب پر ایک سفید تختی آویزاں تھی "مزکیتا۔ اس جانب"۔ میں نے سر جھکا کر پہلا قدم اُٹھایا، اور ٹائم مشین میں بیٹھے کسی ذی رُوح کی مانند صدیوں کے فاصلے آنکھ جھپکتے میں طے کر لیے۔ میں ماضی میں تھا۔

لورکا کے دل کا سب سے نازک کونہ قرطبہ کے لیے ہی مخصوص تھا جسے اُس نے ایک ایسی اُداس اور حسین عورت سے تشبیہ دی جس کے حُزن کا سبب کوئی نہیں جانتا۔ مچادو نے اِسے "خاموش۔ مُوروں کا قرطبہ" کہا۔ میں نے جو قرطبہ دیکھا وہ خوشبوؤں کا شہر تھا، شوخ رنگوں کی تصویر تھا۔ ایک روشن منظر تھا۔ میں اُسے "خوشبو، رنگ اور روشنی کا قرطبہ" کہتا ہوں۔ در و دیوار سے گُتھی ہوئی نیاز بو۔ گلاب اور چنبیلی کی بیلوں میں سے مائل بہ سفر خوشبو، کھڑکیوں میں لگے پُرپیچ آہنی سلاخوں کے آگے رکھے سرخ گملوں میں کھلے جرنیم اور کارنیشن کے بے شمار پھول۔ دُور سے دیکھیں تو دیواروں کی چندھیا دینے والی سفیدی کے پس منظر پر شوخ رنگوں کے دھبوں کی صورت نظر آتے ہیں اور روشنی......... قلعی کیے ہوئے ان تمام مکانوں کی جن پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ عربوں کی تعمیر کردہ گلیوں کے ناہموار فرش جن میں پیوستہ گول گول پتھریاں قدموں تلے آتے ہیں جیسے آپ کسی سُوکھی ہوئی ندی کی تہہ پر بچھے کنکروں پر چل رہے ہوں۔ زرد دیواروں کی دراڑوں میں سے جھانکتی خودرو گھاس۔ کچے مکانوں کی چھتوں پر للی کے تنہا پھول۔ انہی گلیوں میں سینکڑوں پاتیو چھپے ہوئے ہیں۔ پاتیو! مُوروں کے صحنی باغ جنھوں نے اپنے حسین باطن اور سادہ ظاہر کے درمیان جالی دار دروازوں کے آہنی نقاب حائل کر رکھے ہیں۔ گلیوں میں چلتے جائیے اور آپ کے ہر سو پوشیدہ حُسن کی جھلکیاں

پاؤں کی زنجیر بنتی چلی جاتی ہیں۔ بلندی سے قدیم قرطبہ ایسے نظر آتا ہے جیسے پہلے ایک وسیع باغ تھا۔ پھولوں، بیلوں کے جھنڈ اور لاتعداد اُبلتے فوارے اور پھر ان کے گرد سفید درودیوار کچھ یوں اُٹھے کہ اُسے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خوش رنگ قطعات میں منتشر کر دیا۔

آج صبح شہر آنے سے پیشتر جب میں نے حسن سے مسجد کا راستہ دریافت کیا تو وہ اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہنے لگا "تم تو پچھلی شب کہتے تھے کہ اس مسجد کی محرابوں نے تمہیں ایک ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔ بس اسی ڈور کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ خود بخود پہنچ جاؤ گے۔"

چنانچہ اب میں سمت کا تعین کئے بغیر ایک ایسی مچھلی کی مانند خاموشی سے تیرتا چلا جا رہا تھا جسے معلوم تھا کہ وہ جان بوجھ کر شکار ہو چکی ہے اور شکاری دھیرے دھیرے ڈور سے اُسے کنارے کی جانب کھینچ رہا ہے۔

فصیلِ قرطبہ کے پائیں باغ میں باب المدور کے سامنے مشہور رومی ڈرامہ نگار اور فلسفی سنیکا کا سفید مجسمہ ایستادہ تھا۔ قدموں میں ایک وسیع تالاب میں بیشمار مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ سنیکا جلتے ہوئے روم کا تماشہ دیکھنے والے شہنشاہ نیرو کا اُستاد تھا۔ "آگ سونے کو کندن بناتی ہے اور بدنصیبی انسان کو" نیرو کے حکم پر خودکشی کرنے سے پیشتر سنیکا کے آخری الفاظ۔

باب المدور میں داخل ہوتے ہی المنظر اور ابن رُشد کے پُرانے محلے ہیں جہاں عربوں کے عہد میں یہودی رہائش پذیر تھے۔ صلاح الدین ایوبی کے ذاتی معالج یہودی ابن میمون کا مجسمہ اس کے گھر کے سامنے نصب ہے۔ یہودی آج بھی اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ لاعلاج مریض اگر قاہرہ میں واقع ابن میمون کے عبادت خانے میں ایک شب بسر کرے تو اُسے مکمل شفا ہو جاتی ہے۔ ابن میمون کا انتقال قاہرہ میں ہوا جہاں وصیت کے مطابق اس کی لاش کو

ہاتھوں پر اُٹھا کر اس راستے پر لے جایا گیا جہاں سے کبھی حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کو لے کر گذرے تھے۔ بقول القفطی ماہر طب ابن میمون آخری عمر میں مسلمان ہو گیا تھا۔

ایونیوا یوے روس یا ابن رُشد سٹریٹ اُن دنوں کی یاد دلاتی ہے جب عظیم فلسفی ابن رُشد انہی گلیوں میں سر جھکائے قرآن اور افلاطون کے فلسفے میں باہمی ربط کی تلاش میں سوچ بچار کیا کرتا تھا جس نے المنصور کے دربار میں اشبیلیہ پر قرطبہ کی علمی فضیلت کے بارے میں ایک بحث کے دوران ابن ظہر سے کہا تھا "مجھے معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں مگر مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ جب قرطبہ میں کوئی موسیقار مرتا ہے تو اس کے ساز اشبیلیہ بھیجے جاتے ہیں جہاں وہ بک جاتے ہیں، لیکن جب ایک عالم اشبیلیہ میں فوت ہوتا ہے اور حکومت اس کی کتابیں فروخت کرنا چاہتی ہے تو وہ قرطبہ بھیج دی جاتی ہیں۔" دانتے نے افلاطون میرا اُستاد ہے اور ابن رشد اس کا پیغامبر کے الفاظ میں ابن رشد کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اہلِ قرطبہ ابن رشد کو مسلمان ہونے کے باوجود آج بھی اپنا عظیم ترین فرزند سمجھتے ہیں۔ اُن کے اس فخر کی علامت سنگِ مرمر کا وہ خوبصورت مجسمہ ہے جو القصر کی دیوار کے سامنے میں نصب ہے۔ ابن رشد عرب لبادے میں ملبوس، سر پر ایک تہہ دار پگڑی اور پاؤں میں ایک نوک دار جوتی۔ فلسفے کی پنہائیوں میں کھویا ہوا۔

ایونیوا لیوے روس کے قریب قرطبہ کا میونسپل ہسپتال ہے اور یہاں ایک مرتبہ پھر آپ کو اس شہر پر عرب تہذیب کے ہمہ گیر اثرات کا ایک اور پہلو علم بدن کے ماہر الغافقی کے مجسمے کی صورت میں ملتا ہے۔ اس مجسمے کو پہلی بار میں نے ایک اندھیری شب میں دیکھا جب قرطبہ کی گلیاں سنسان ہو چکی تھیں اور میں کیمپنگ واپس جا رہا تھا۔ مجھے واہمہ سا ہوا کہ ایک تاریک گلی کے آخر میں کوئی عرب ساکت

لگتا مجھے گھور رہا ہے۔ میں خوفزدہ ہو گیا مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ ایک سفید مجسمہ ہے۔ دیا سلائی جلا کر کندہ عبارت پڑھی "الغافقی"۔ اس وقت میں اس ماہرِ طب کے نام سے ناواقف تھا بہر حال یادداشت کے طور پر اپنی ڈائری میں نوٹ لکھا "آج شب ایک تاریک گلی میں الغافقی نام کے کسی عرب کا مجسمہ دیکھا جانے کون ہے جس پر آج بھی قرطبہ کو ناز ہے۔" عربوں کا سب سے بڑا سرجن الظاہروی بھی قرطبہ میں پیدا ہوا تھا۔ بقول فلپ ہٹی جدید یورپی سرجری کی بنیاد الظاہروی کی وہ کتاب ہے جو اس نے علم بدن پر تحریر کی۔ میں نے باب اشبیلیہ کے باہر ایک ندی کے کنارے ابنِ حزم کا ایک مجسمہ بھی دیکھا جو شہرۂ آفاق شعری مجموعے "طوقِ الحمامہ" کے علاوہ چار سو کتب کا مصنف تھا۔ ابنِ حزم مذہبی تقابل کے میدان میں دنیا کا اولین مفکر تھا۔ قرطبہ کی خاک سے جنم لینے والوں اور یہاں کے خاک نشینوں میں سے کس کس کا نام لوں .... ابنِ زیدون - ابنِ فاروقی - ابنِ داؤد - ابنِ عبد الرابی - ابنِ قحفانی - البقری - المجریطی - الکرمانی - غرضیکہ نابغۂ روزگار شخصیتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ عام خیال کے برعکس شہر کے گلی کوچوں میں القصر اور قدیم فصیل کے سائے میں ایستادہ مجسمے ماضی کی عظمتوں کے وہ نشان ہیں جو اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ اہلِ قرطبہ عرب ماضی کو اپناتے ہیں تسلیم کرتے ہیں۔ انھیں اس پر فخر ہے۔

قدیم قرطبہ میں وہ کونسی ایسی کشش تھی جس کا طلسم آج بھی ان گلیوں میں خاموشی سے رواں ہے! فلپ ہٹی نے اسے بغداد اور قسطنطنیہ کے ہمراہ دنیا کے تین روشن ترین شہروں میں شمار کیا۔ دس لاکھ سے زائد آبادی کے اس شہر میں ایک لاکھ تیرہ ہزار مکان اور حویلیاں، تین سو عالیشان حمام اور ستر سرکاری لائبریریاں تھیں جہاں تین ہزار خواتین قلمی نسخوں کی کتابت پر مامور تھیں۔ میل ہا میل تک

پختہ سڑکوں کا ایک سلسلہ تھا اور ہر مکان کے دروازے پر ایک لالٹین نصب تھی جبکہ اس عہد کے سات سو برس بعد تک بھی لنڈن کے بعض گلی کوچوں کو ایک بھی روشنی میسر نہ تھی اور پیرس میں بارش کے بعد جو کوئی بھی گھر سے باہر قدم رکھتا گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتا۔ شدید گرمی میں تمام شاہراہوں پر سائبان تان دیئے جاتے جو مسافر باب المدور سے شہر میں داخل ہوتا وہ وادی الکبیر کے پل تک ان کی چھاؤں میں سفر کرتا۔ اس روایت کی پیروی محدود پیمانے پر اب بھی جاری ہے۔ میں باب المدور میں سے آنے والی سڑک کو ندے گوندے مار کے ایک قہوہ خانے میں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ کارپوریشن کے عملے نے لمبے بانسوں کی مدد سے پوری شاہراہ پر سائبان کھول دیئے اور کوندے گوندے مار قدیم زمانوں کی طرح سورج کی تپش سے محفوظ ایک سایہ دار راہگذر بن گئی۔

اندلس اور بقیہ یورپ کے درمیان تہذیب و تمدن کی اتنی وسیع خلیج حائل تھی کہ تولیدو کے مُنصف سعید کو یورپ کے باشندوں کے بارے میں کہنا پڑا "ان کی آب و ہوا سرد اور فضا ابر آلود ہے چنانچہ سورج کی کرنیں ان کے دماغ تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اس لیے اُن کے مزاج سرد ہیں اور اُن کے مزاج میں چکڑ پن ہے۔ ان کے سفید جسم پھولے ہوئے ہیں اور بال بے تحاشا بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ حاضر جوابی سے ناواقف ہیں اور ان کی عقل میں کچھ نہیں آتا جب کہ حماقت اور بدتمیزی ان میں عام ہیں۔" احساسِ برتری کا یہ جذبہ شاید ناروا بھی نہ تھا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن دنوں آکسفورڈ کے معلم غسل کو ایک عظیم گناہ قرار دیتے تھے قرطبہ کے سائنسدان اور فلسفی شاندار حماموں میں بیٹھے علمی بحثوں میں محو تھے۔ ڈوزی کہتا ہے کہ اُس عہد میں اندلس کا ہر فرد تعلیم یافتہ تھا۔ جب کہ یورپ میں پادری بھی کورے اَن پڑھ تھے۔ ہمسایہ عیسائی حکمرانوں کو اگر تعمیر، لباس تراشی اور طب کے میدان میں کسی ماہر کی ضرورت پیش آتی تو

وہ قرطبہ کی جانب رجوع کرتے۔ ادھر اگر مسجد قرطبہ کی بین الاقوامی درس گاہ میں ایک پوپ زیرِ تعلیم تھا تو اُدھر پیرس کی ساربون یونیورسٹی ایک ایسی عمارت میں واقع تھی جس کی بالائی منزل پر تو درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور زیریں حصّہ میں رنڈیاں پیشہ کرتیں۔ قرطبہ میں چمڑے، کاغذ اور کپڑے کی صنعتیں بھی مُورش دستکاروں نے قائم کیں۔ آج بھی دیوارِ مسجد کے مقابل بازار میں چمڑے کی ایسی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں جن پر کندہ نقش و نگار اور ڈیزائن خالص مُورش ہیں۔ زیرِ زمین نالیوں کے نظام کے علاوہ قرطبہ یورپ کا پہلا شہر تھا، جہاں سرکاری طور پر ہر گھر میں آب رسانی کا انتظام تھا۔ ایک قرطبین نے مجھے بتایا کہ اُس کے پاتیو کے فوارے میں اُبلتا پانی اب تک اُسی تانبے کے پائپ میں سے گزر کر آتا ہے جو صدیوں پیشتر مُورش کاریگروں نے زیرِ زمین بچھایا تھا۔ قرطبہ کا زریں مُورش عہد پانچ سو برس پر محیط ہے اور اس کے خاتمے پر جیمز مشنر کے بقول عیسائیوں نے آخری جنگ تو جیت لی مگر شاعری، فلسفے، طب اور زراعت کی جنگ ہار گئے۔

آج کا قرطبہ خاموش اور اُداس تو ہے مگر میں اُن سیاحوں سے اتفاق نہیں کرتا جو اسے ایک پُرانی تہذیب کا مُردہ کھنڈر کہتے ہیں۔ ایسے سیاح تاریخ کے صفحوں میں گُم قرطبہ آتے ہیں۔ وہ ایک زندہ شہر اور اس کے زندہ دل لوگوں کے درمیان ماضی کے بجرے میں بند چلتے ہیں اور دبیز کتابوں کی اوٹ میں یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ قرطبہ کے اکثر مکانوں کی کھڑکیاں منقش آہنی جالیوں سے مزیّن ہیں جن میں آراستہ نیلے گملوں میں سے خوش رنگ پھول باہر جھانکتے ہیں۔ یہ خوش رنگ پھول شاندار ماضی ہیں جنھیں دیدۂ بینا وقت کی اُس دیوار کے پار دیکھ لیتی ہے جو پُرپیچ جالیوں کی صورت میں درمیان میں حائل ہے۔ سو ہم جو پچھلے زمانوں میں بھی جیتے ہیں حال کے رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں میں سانس

لیتے ہوئے بجائے اس کے کہ ہم ہمہ وقت ایک ایسی عینک لگا کر اشیاء کا مشاہدہ کرتے رہیں جس کے شیشوں پر تاریخ کی روشنائی مل دی گئی ہو۔ یورپ میں کونسا ایسا حُسن پرست شہر ہے جہاں موسمِ بہار میں "فی استا دے پاتیو کوردوبس" ایسا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ چاردیواریوں میں گھرے مختصر باغوں یا پاتیو کو سجانے کا سالانہ جشن۔ رات کے پچھلے پہر اس کی گلیوں میں کانتے ہوندو کی قدیم عرب موسیقی گونجتی ہے۔ صحرا نشینوں کے تعمیر کردہ خوش وضع فوارے اب بھی چوکوں اور پاتیوز میں رواں ہیں۔ چشمِ غزال اگرچہ کم کم ہے مگر دلنشینی بدستور قائم ہے۔ پلازا خوسے انتونیو کے گھڑیال کی موسیقیت سے لبریز آواز جب نصف شب شہر کے بام و در پہ گونجتی ہے تو بدن میں ایک خوشگوار سنسنی پھیلنے لگتی ہے۔ کیا یہ ایک مُردہ شہر کی نشانیاں ہیں۔؟

"ڈوکو" کے عرب محلے میں سے گزرتے ہوئے مجھے ایک منقّش پھاٹک نظر آیا جس کے پُرپیچ نقاب کے پیچھے شاید قرطبہ کا حسین ترین پاتیو چھپا ہُوا تھا۔ میں تصویر بنانے کے لیے اس آہنی چلمن کے سوراخوں میں سے تاک جھانک کر رہا تھا کہ ایک مُعمّر خاتون نے چپکے سے پھاٹک کھول دیا۔

"یوں چوروں کی طرح کیوں جھانک رہے ہو۔ اندر آکر دیکھ لو۔"

چنانچہ اندر جا کر دیکھا۔ پاتیو کی چاردیواری مارشل نیل قسم کے گلاب اور عشق پیچاں کی تہ دار بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان میں کہیں کہیں مُسلم نیلے رنگ کے گملے بے ترتیبی سے ٹنگے ہوئے تھے۔ ان گملوں میں پھولدار پودے اور جنگلی گھاس کی مختلف اقسام اُگی ہوئی تھیں۔ صحن گول سنگریزوں سے ترتیب دیا ہُوا تھا۔ بیچ میں ایک ٹھگنا سا کائی آلود فوارہ تھا جس کا پانی پیالے کے کناروں سے بہ کر سنگریزوں پر پھیل رہا تھا۔ خوشگوار ٹھنڈک اور سکون کی ایک ایسی فضا جو ایک مرتبہ لاہور کی تپتی دوپہر میں میں نے مبارک حویلی موچی دروازے کے اندر ایک کچی کوٹھڑی میں لیٹے ہوئے

محسوس کی تھی۔ پاتیو کے عقب میں گملوں کے درمیان گچ کی بنی ہوئی تین مُورِش طرز کی انتہائی خوبصورت محرابیں کھڑی تھیں جو خطِ کوفی میں لکھے گئے کلمہ شریف سے مزین تھیں۔ قدامت کے باوجود یُوں لگتا تھا جیسے ابھی پچھلے ہفتے ہی انہیں تعمیر کیا گیا ہو۔ عرب صناعی کے دیدہ زیب شاہکار۔ ایک کونے میں سُرخ ٹاٹوں سے ڈھکا ہُوا ایک قدیم کنواں تھا۔ قریب ہی پُرانی وضع کی دو صراحیاں اور مٹکے دھرے تھے، دیواروں کو گملوں کے علاوہ پیتل کے چمکتے ظروف سے بھی سجایا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنی بلندی پر ٹنگے گملوں کی آبیاری کیونکر کی جاتی ہے۔ میں نے بوڑھی مالکن سے دریافت کیا تو وہ سفید بالوں کا جوڑا درست کرتی ہوئی بولی "بہت آسان ہے" اور کونے میں رکھا ایک طویل بانس اُٹھا لائی جس کے سرے پر ایک ٹین کا ڈبہ ترچھے رُخ بندھا تھا۔ اُس نے یہ خود ساختہ آبی پیمانہ کنوئیں کی تہہ میں اُتارا، اور پتنگیں لُوٹنے کے انداز میں اُسے سیدھا کھڑا کر کے ایک گملے پر جھکا دیا۔ لبالب گملے میں اُگی گھاس سیراب ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گملے کے نچلے سوراخ میں سے پانی ٹپکنے لگا۔ میں نے اس مظاہرے کا شکریہ ادا کیا اور پاتیو کی تعریف کرنے کے بعد باہر جانے کو تھا کہ اُس نے میرا بازو تھام کر پوچھا۔

"میری مُورِش محرابیں نہیں دیکھیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی بنوائی ہیں۔"

"پچھلے ہفتے؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں! ٹورسٹ پسند کرتے ہیں۔ جس پاتیو میں محراب نہ ہو اُسے دیکھنے نہیں جاتے۔"

قرطبہ کی گلیوں میں دن کے وقت سیاحوں کے علاوہ صرف چھوٹے بچے ملتے ہیں۔ مرد عموماً کام پر چلے جاتے ہیں۔ عورتیں اگر جوان ہوں تو گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اگر ادھیڑ عمر ہوں تو انہیں دروازوں کے باہر سیاحوں کو اپنا پاتیو دکھانے کے لیے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اگر ایک سیاح بھی ان کے پاتیو کی

دل کھول کر تعریف کر دے تو انہیں سارے دن کی بیٹھک کا صلہ مل جاتا ہے۔ رات کو دادی اماں پورے خاندان کے سامنے رپورٹ دیتی ہیں اور بڑے فخر سے اعلان کرتی ہیں کہ آج ہمارے پاتیو کو اتنے درجن سیاحوں نے دیکھا۔

"ذوکو" کے محلے میں چند ایسے مکان بھی ہیں جو عربوں کے زمانے میں مسلمانوں کی حویلیاں تھے۔ تاریخ میں ان کے بڑے عجیب و غریب نام درج ہیں۔ "پھولوں والی"، "پیار کی شدت"، "خوشبوؤں کا گھر" وغیرہ۔ میں یونہی پاتیوز میں جھانکتا تنگ گلیوں میں آفتاب کی تمازت سے بچنے کی خاطر دیواروں کے سائے میں چلتا پلازا دے پوترو تک پہنچ گیا۔ میں نے کھلے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ نیلاہٹ سپاٹ اور بیکراں تھی۔ اس کی وسعتوں میں مجھے کہیں بھی مسجد قرطبہ کا مینار بلند ہوتا نظر نہ آیا۔ چوک کے درمیان میں ایک پُرانی طرز کے فوّارے کے پیالے میں چند قرطبی بچے نیکریں پہنے نہانے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُن میں سے ایک چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور فٹ پاتھ پر پڑا پلاسٹک کا لفافہ اُٹھا کر میرے پاس آ گیا۔

"ایس استد مورو؟"

"سی" میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ شاید مُوروں کی بات ہوئی تھی۔

"پوستا کاردو۔ مزکیتا!" اُس نے لفافے میں سے مسجد کا ایک تصویری پوسٹ کارڈ نکال کر آگے کر دیا "فائیو پسیتہ"۔

میں نے پانچ پسیتے کا سکہ اُس کی گیلی ہتھیلی پر رکھ کر کارڈ لے لیا اور وہ پھر فوّارے کے پیالے میں گھُس کر نہانے میں مشغول ہو گیا۔

ہجومِ تخیل

کالے کومیدا اس کے پہلو میں سے ایک تنگ گلی نکلتی ہے، کالے لاس فلارس یعنی پھولوں کی گلی۔ بالکل اسم بامسمیٰ، سجاوٹ میں اتنی نفاست گمان ہوتا ہے کہ کسی جاپانی گیشا گرل نے پھولوں اور شاخوں کو ترتیب دیا ہے۔

لاس فلورس کے پھولوں میں مجھے مسجد قرطبہ کے زرد مینار کی پہلی جھلک دکھائی دی۔ ایک چوکور رجحم قرطبہ کے نیلے آسمان کی وسعتوں کو چھو رہا تھا۔ مینار کی چوٹی پر تین بڑے گھڑیال یوں لٹکے ہوئے تھے جیسے کسی نے تین سیاہ کنول اُٹھا کر رکھ دیئے ہوں۔ مجھے تو چوٹی کے اُوپر صرف قرطبہ کے حفاظتی سینٹ رافیل کا مجسمہ ہاتھ پھیلائے شہر کی عمارتوں پر سایہ فگن دکھائی دیا۔ میں اقبالؒ کی چشم بینا کہاں سے لاتا جسے یہ منارِ بلند جلوہ گہ جبرئیل نظر آیا اور میں نیچی اینٹوں کی ایک محراب میں پیوست بند پھاٹک کا زنگ آلود کنڈا سرکایا اور میں مسجدِ قرطبہ کے مینار کے قدموں میں کھڑا تھا۔

ہشام کے تعمیر کردہ اس شامی طرز کے چوکور مینار کے پہلو میں سے نکلتی ہوئی ایک فصیل نما زرد دیوار نے جامع قرطبہ کے صحن اور ڈھکے ہوئے حصے کو اپنے شکستہ بازوؤں میں سمیٹا ہُوا تھا۔ باب توبہ کھلا تھا۔ باب توبہ مینار کے نیچے صحنِ مسجد میں داخل ہونے کا واحد راستہ ہے۔ آہنی کواڑوں پر پیوستہ سینکڑوں چھوٹی چھوٹی پتریاں خط کوفی میں کندہ کلمہ شریف کا ورد کر رہی تھیں۔

مسجد کی تعمیر کے اوّلین سالوں میں یہ بلند محراب نما پھاٹک پورا کا پورا سونے کے کام سے مزین تھا۔ قرطبہ کی دھوپ میں باب توبہ کی سنہری چمک "ذوکو" کی نیم تاریک گلیوں کو بھی روشن کر دیتی۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد اس صدر دروازے کو بھی بقیہ عمارت کی طرح حضرت مریم اور عیسےٰ کی شبیہوں سے بپتسمہ دے دیا گیا۔ میں زرد مینار کے قدموں میں باب توبہ کے سامنے دیر تک کھڑا رہا۔ یکدم اندر جانے کو جی نہ چاہتا تھا مگر پھر صحن میں دکھائی دینے والے نارنگی اور کھجور کے درخت ہوا سے یوں حرکت میں آئے جیسے مجھے اپنی جانب بلاتے ہوں۔ شکاری نے بھی ڈور اس شدت سے کھینچی کہ قدم خود بخود اُٹھنے لگے اور میں مسجد قرطبہ کے صحن نارنجستان میں داخل ہو گیا۔

قرطبی شاعر رکارڈو نے اسے "چمکتی دھوپ اور سالوں کا صحن" کہا ہے۔ پستہ قد نارنگی کے درختوں میں سے بلند ہو کر تن آور کھجور کے چھتنار پتے مینار کی دوسری منزل تک پہنچ رہے تھے اور ان کے سائے ہوا کے چلنے سے ایک تواتر کے ساتھ پھیلتے اور پھر سمٹتے چلے جاتے۔ گم گشتہ حُسن کی متحرک پرچھائیں کی طرح۔ بائیں جانب زیتون کے ایک صدیوں پرانے درخت کے سائے میں وضو کا تالاب تھا جس کے چاروں کونوں میں ایستادہ فواروں کا پانی ایک ابدی تسلسل کے ساتھ حوض میں گر رہا تھا۔ حاکم کا تعمیر کردہ یہ تالاب زیتون کی قربت کی مناسبت سے "زیتون کا فوارہ" کہلاتا ہے۔ حاکم کے عہد سے پیشتر پانی سے بھرے ہوئے مٹکے خچروں پر لاد کر صحن میں لائے جاتے اور یوں روزانہ تالاب کو بھرا جاتا۔ حاکم نے سرا مورینا کی بلندیوں پر نئے حوض تعمیر کروائے اور پھر تانبے کے نلوں کے ذریعے ان کا پانی مسجد کے تالابوں تک پہنچا کر مسلسل آب رسانی کا انتظام کیا۔ "زیتون کے فوارے" میں اب تک حاکم کے بچھائے ہوئے نلوں کے ذریعے ہی پانی آتا ہے۔ نارنگیوں کے پتوں سے چھنکتے اسی صحن

میں بیٹھ کر المنصور نے اندلس کی وزارتِ عظمیٰ کا خواب دیکھا اور پھر اس مسجد کی بیرونی دیواریں شاہد ہیں کہ المنصور سینٹ جیمز کا ناقابلِ تسخیر اور مغرور شہر سانتی ایگو فتح کر کے لوٹ رہا ہے اور اس کی فوج کے آگے آگے ہزاروں شاہی قیدی سانتی ایگو کے کلیسائے اعظم کا وزنی گھڑیال اور صدر دروازہ کندھوں پر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ گھڑیال اور آہنی دروازے کو پگھلا کر مسجد کے لیے دو سو اسی فانوس ڈھالے گئے۔

میرے عقب میں باب توبہ تھا۔ دائیں اور بائیں نارنگیوں کے درختوں کی قطاریں ان طویل برآمدوں تک پہنچتی تھیں جو دیوار کے ساتھ ساتھ چلے آتے ہیں۔ کلیسا میں صبح کی عبادت کو آنے والے انہی برآمدوں میں کھلتے ہوئے دو دروازوں میں سے صحن کے اندر داخل ہوتے ہیں اور میرے سامنے بظاہر ہر طرف سے بند ایک غیر مؤثر مستطیل عمارت کھڑی تھی جس کی سرخ ٹائلوں کی چھت میں سے جا بجا تکونے آتش دان نما برج اٹھے ہوئے تھے۔ طرزِ تعمیر سے مسجد کی بجائے کسی قدیم حویلی کا گمان ہوتا تھا۔ سامنے کی پوری دیوار میں محراب نما دروازوں کی ایک قطار تھی جو کسی زمانے میں صحن پر کھلتے تھے مگر پھر ایسے عبادت گذار آئے جن کے لیے معبد میں روشنی کا تصور ناقابلِ برداشت تھا۔ مسجد نے کلیسا کا روپ دھارا تو ایک کے سوا تمام کے تمام محرابی دروازے بھوری اینٹوں سے چن دیئے گئے۔ اینٹوں سے پُر یہ محرابی دروازے اس اندھے کی طرح بے بس اور لاچار کھڑے ہیں جو صدیوں روشنی سے آشنا ہونے کے بعد اپنے آگے تاریکیوں کی ایک دیوار کھڑی دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ ایک بلند محرابی دروازہ جسے اینٹوں کی بجائے لکڑی کے تختوں سے بند کیا گیا تھا مسجد میں داخلے کی واحد صورت نظر آتا تھا۔ محراب کے اوپر ایک نو تعمیر کردہ چوکھٹے پر مریم کا بت نصب تھا اور لاطینی زبان میں مذہبی دعائیں

درج تھیں۔ بائیں ہاتھ پر دروازے کے پہلو میں نیلی وردی پہنے ایک موٹا ہسپانوی لکڑی کی ایک کیبن کے ساتھ ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے انتہائی عجلت میں اخبار سمیٹا اور بغل میں دابی ٹوپی سر پر جما کر جلدی سے کیبن میں گھس گیا۔

"موسیو تورستا!" اس نے کیبن کے سوراخ میں سے ہاتھ نکال کر کاؤنٹر بجایا۔ "بیس پسیتے۔"

مسجد میں داخلے کا پروانہ یا لائسنس ڈی وزتا سبز رنگ کا تھا اور اس پر کلیسائے قرطبہ کی زیارت کے لیے۔ بیس پسیتے۔ نمبر ۵۸۹۹..." کے الفاظ درج تھے۔ بیس پسیتے صندوقچی میں گرا کر مسجد کا موٹا محافظ پھر کیبن سے باہر نکل آیا اور بڑے اہتمام سے چلتا ہوا دروازے میں چنے تختوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"موسیو تورستا!" اس نے انگلی میں خم دے کر مجھے اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے اپنے ہی جاری کیے ہوئے ٹکٹ کو نہایت غور سے جانچا اور پھر ایک کونہ علیحدہ کر کے مجھے واپس کر دیا۔

"صبح بخیر! آپ آج صبح کلیسا کی زیارت کے لیے آنے والے پہلے سیاح ہیں۔" اس نے ٹوپی اتار کر بغل میں داب لی اور مسکرا کر کہا۔

"صبح بخیر" میں نے ٹکٹ کا بقیہ حصہ نہایت احترام کے ساتھ اپنی جیب میں محفوظ کرتے ہوئے جواب دیا "میں آج صبح مسجد......... کی زیارت کے لیے آنے والا پہلا سیاح ہوں۔"

محافظ کے چہرے سے مسکراہٹ فوری طور پر غائب ہو گئی۔ اس نے مزید گفتگو کی بجائے اپنی ٹوپی پھر سر پر جما کر اسے غصے سے تھپکا اور لکڑی کی دیوار میں نصب ایک چھوٹے سے پھاٹک کی چٹخنی کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے جونہی تاریکی کے اس مستطیل ٹکڑے کے اندر قدم رکھا میرے پیچھے پھاٹک

بند ہو گیا۔ کھٹاک! چٹخنی چڑھانے کی آواز وسیع خلاؤں میں گونج گئی۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ کٹ چکا تھا۔

میں خنک اندھیروں کی بے کراں خلاؤں میں تنہا کھڑا تھا۔ میں تنہا اور دور افتادہ گر کھچاؤ سے آزاد اور پُرسکون۔ پھر گھپ اندھیرا تاریکی میں بدلنے لگا۔ میرے گرد آپس میں گڈمڈ ہوتی ہوئی نامعلوم شبیہیں تھیں۔ بے جہت ہیولے حرکت میں تھے۔ تاریکی سے نیم تاریکی تک کے سفر میں مدتیں بیت گئیں۔ خلاؤں میں اب غیر واضح نقوش بھرنے لگے۔ پھر بکھرتے، تیرتے نقوش یکجا ہو کر ساکت ہو گئے۔ ایک سنسان اور گھنا جنگل۔ میں آنکھیں جھپکے بغیر اپنے دونوں ہاتھ فقیروں کی طرح سامنے پھیلائے آگے بڑھا۔ سہارے کی متلاشی انگلیاں کسی سرد مرمریں شے سے چھو گئیں۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُسے ٹٹولا۔ شفاف سطح پر انگلیاں پھسلیں اور پھر چند اُبھرے ہوئے الفاظ پر اٹک گئیں۔ میں نے اُبھری ہوئی عبارت پر آہستہ آہستہ اپنے پپوٹے دبائے۔ آنکھوں سے محروم ایک شخص کی طرح جو خطِ بریل کو اپنی انگلیوں کے لمس سے پڑھنے کی پہلی کوشش میں مصروف ہو۔ پپوٹوں کی ٹٹولتی آنکھوں نے خبر کی۔ پہلے "لا" ہے۔ اس کے بعد "الہٰ" آتا ہے۔ اور .... اور پھر تن مادے سے کٹنے کے بعد میرے کانوں میں اُترنے والی پہلی آواز گونجی۔ لاالہٰ الااللہ محمد رسول اللہ۔ اندھیرے چھٹنے لگے۔ میرے گرد کا خلا بنفشی، ارغوانی سنگِ مرمر کے نازک ستونوں کے ایک جنگل میں بدلنے لگا۔ شام کے صحراؤں میں اک ہجومِ نخیل مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے نیم تاریکی میں ہزاروں بنفشی، ارغوانی، سیاہ اور زرد کنول ایک غیر فانی شب کے خنک سکوت میں مرجھائے ہوں، ماند پڑتے جا رہے ہوں مگر ان کا رنگ پھیکا پڑنے کی بجائے مزید شوخ ہو رہا ہے۔ کنول کے اس کملاتے ہوئے جنگل میں حسن بیمار کی سی دلکشی تھی: جیسے پوری مسجد ایک خاموش اور ٹھنڈی آگ، سنگِ مرمر کی آگ میں

جل رہی ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے، مر چکا ہے، سرد ہو چکا ہے مگر جل رہا ہے۔ اس میں حدت ہے حسنِ رفتہ کی۔ ستونوں کے اوپر کسی گھنے برگد کی طرح سُرخ اور سفید دوہری محرابیں نیم دائروں کی صورت میں تاحدِ نظر پھیلتی جا رہی تھیں۔ تو لنگ نے کہا تھا۔

"میں ایک بید کے درخت کی مانند ہوں۔
ہوا تھم جائے تو
میں ساکت کھڑا رہتا ہوں۔
اور اگر ہوا چلے تو
میں بھی حرکت میں آجاتا ہوں:"

یہ ستون بید کے درختوں کی طرح ہوا کی غیر موجودگی میں پُرسکون اور ساکت کھڑے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے ہوا کے ہولے سے چلنے سے ہی یہ سیمسن کے معبد کی طرح منہدم ہونے لگیں گے۔ صحراؤں میں بادِ نسیم کے پہلے جھونکے سے ہی ہجومِ نخیل زمیں بوس ہو جائے گا۔

مسجد قرطبہ کو اپنی مرمریں ہتھیلیوں پر سہارا دینے والے اجسام خصوصی طور پہ اس عمارت کے لیے نہیں تراشے گئے تھے بلکہ مسجد کا نقشہ ان قدیم ستونوں کی ساخت اور بُلندی کو مدِنظر رکھ کر بنایا گیا تھا۔ انھیں تخلیق کرنے والے فنکاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ان کے تراشیدہ شاہکار صدیوں تک افریقہ کے رومی معبدوں اور کارتھیج ایسے شہروں کے کھنڈروں میں دفن رہیں گے اور پھر امیر عبدالرحمٰن کے حکم پر انھیں کھود کر قرطبہ لے جایا جائے گا جہاں ان کے کندھوں پر کسی معبد یا قصرِ شاہی کی بجائے ایک ایسی عمارت کی محرابیں اُٹھیں گی جسے دنیا کی سب سے بڑی مسقف مسجد ہونے کا امتیاز حاصل ہو گا۔ بادشاہی مسجد لاہور کے ۲۱۵ × ۱۰۰ کے مقابلے میں مسجدِ قرطبہ کا مسقف رقبہ ۴۴۰ × ۶۲۰ فٹ ہے۔

مسجدِ قرطبہ میں پھیلے کل ستونوں کی تعداد ۱۰۹۲ ہے اور ان میں سے ہر ایک کا رنگ، سنگِ مرمر کی قسم اور نقش و نگار بالکل مختلف ہیں۔ گولائی تقریباً یکساں ہے، بلندی بارہ فٹ رکھی گئی ہے۔ چونکہ ان ستونوں کی اوسط بلندی مسجد کی مجوزہ چھت کی بلندی سے کہیں کم تھی اس لیے ان پر دوہری محرابیں تعمیر ہوئیں اور ان پر قوسوں کے گنبتے بنا کر چھت تک لے جایا گیا۔ تمام ستونوں کے زیریں حصے واضح طور پر بے حد چمکیلے اور ملائم ہیں۔ گزرے زمانے کے لاکھوں عقیدت مندوں کے کندھوں اور ہاتھوں کے پُرتقدس لمس کا ثبوت!

میں ایک بھٹکے ہوئے آہو کی طرح حیران کھڑا تھا۔ سوئے حرم تو کیا میں خود حرم میں تھا۔ کس سمت قدم بڑھاؤں تو منزل سامنے آئے گی۔ شاید یہی منزل تھی اسی لیے وہ کشش جو میری روح میں پھانس کی طرح اٹکی مجھے لاہور سے اس حرمِ پاک تک کھینچ لائی تھی اب دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہی تھی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ اس وقت سوائے میرے پوری مسجد میں اور کوئی سیاح موجود نہ تھا۔ کیا میں اس عمارت کو صرف اور صرف ایک سیاح کی نظر سے دیکھ رہا ہوں؟ میں جو کہ ایک گم گشتہ روح ہوں جسے علم کی روشنی نے راستہ دکھانے کی بجائے وسوسوں اور شکوک کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا ہے۔ اگر مجھے دنیا کے تمام مذاہب میں سچائی کا پرتو نظر آتا ہے تو صرف اس عمارت کی کشش مجھے اتنی دور سے کیوں کھینچ لائی ہے۔ میں سینٹ پیٹرز روم یا نوترے ڈیم پیرس کی جانب کیوں نہ چلا گیا؟

میں نے آہستہ آہستہ پتھر کی اُن سلوں پر چلنا شروع کر دیا جن پر صدیوں پہلے خلیفۂ وقت بھی ننگے پاؤں چلتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے دبیز بوٹ اس خیال سے نہیں اتارے تھے کہ اگر دوسرے سیاحوں نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔ اس روشن دماغ جدید انسان کا دماغ چل گیا ہے۔ ایک پرانی روایت کے کھنڈر پر ننگے پاؤں چلنے سے اس کے پاؤں نہ چھل جائیں گے، زخموں سے خون نہ رِسے گا:

کھلائے ہوئے کنول کا یہ گھنا جنگل ہمیشہ سے نیم تاریکی میں نہیں ڈوبا رہا۔ صحن کی جانب اکیس محراب دار دروازے کھلتے تھے۔ یوں جس مقام پر ستون ختم ہوتے وہیں سے ایک ہندسی تواتر کے ساتھ کھجوروں کے درخت شروع ہو جاتے۔ ستونوں کی بجائے سیدھے تنے اور محرابوں کی جگہ کھجور کے کماندار پتے۔ عمارت کا باطن، صحن کے ظاہر سے ہم آہنگ ہو جاتا اور مسجد میں بیٹھے عبادت گزاروں، متفکروں اور طالب علموں کی نظریں ستونوں کے جنگل سے پرے کھجور کے درختوں کی قطاروں تک ایک خوش نظر تسلسل میں چلی جاتیں۔ مخالف سمت میں دریا کی جانب بھی کئی محرابیں کھلتی تھیں۔ وادی الکبیر کے رواں پانیوں میں متحرک پن چکیاں اور رومی پُل یہاں سے صاف نظر آتے۔ دائیں جانب القصر کی طرف متعدد دروازے تھے۔ چند دروازے بائیں جانب سڑک پر بھی کھلتے تھے۔ لامحدود وسعتوں کی حامل ایک ایسی بصری تصویر، جو مینارِ مسجد، صحن، ستونوں کے جنگل، بازار اور القصر کے علاوہ وادی الکبیر کے پانیوں پر بھی محیط تھی۔ مسجد کلیسا میں بدلی تو یہ وسعتیں سمٹ گئیں۔ چاروں جانب کھلے دروازوں اور محرابوں کی آنکھیں اینٹوں سے پُر کر دی گئیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے بھڑکیلے چیپل بنا کر ان کے اندر صلیبیں اور پیروں فقیروں کے مجسمے رکھ دیے گئے۔ دن کے وقت تو قرطبہ کے روشن سورج کی کرنیں جن کے آگے دیواریں حائل نہ تھیں مسجد کے گوشے گوشے کو منور کرتیں اور جونہی وادی الکبیر کے پانی شفق سے سرخ ہونے لگتے دو سو اسی فانوسوں میں آویزاں دس ہزار سے زائد شمعیں روشن کر دی جاتیں۔ فرش پر بیش قیمت قالین بچھے تھے اور چھت صحرائے قرطبہ کی منقش لکڑی سے آراستہ تھی۔ ان دنوں اصل چھت کی نشانیاں کہیں کہیں ملتی ہیں۔ بقیہ لکڑی ادھیڑ کر سازوں کی ساخت کے لیے استعمال ہوئی۔ عیسائیوں میں روایت تھی کہ اس دیدہ زیب لکڑی سے بنی ہوئی گٹار میں ہمیشہ ایک حزن آمیز سُریلا پن ہوتا ہے۔ دوسرے روز جب میں مسجد کے

برآمدوں میں گھوم رہا تھا تو چھت کا منقش ٹکڑا فرش پر پڑا ملا۔ پشت پر لگے کسی خاص مصالحے کی وجہ سے ابھی تک بالکل درست حالت میں گھن سے پاک تھا۔

میکسیکو کے گھنے جنگلوں میں پوشیدہ کسی اِنکا اہرام کے کھنڈر کی طرح مسجد کے قالب میں تعمیر کردہ کلیسا ہجوم تخیل میں یوں پنہاں تھا کہ پہلے پہل مجھے اس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے ستون یوں منجمد ہوئے جیسے بنو اسرائیل کو راستہ دینے کے لیے نیل کے پانی سانس روک کر ایک دیوار کی صورت میں ساکت ہو گئے تھے۔ یہاں ستونوں کے اس دریا کے بیچ موسیٰؑ کے عصا کی بجائے عیسےٰ کا کلیسا پھینک دیا تھا لیکن سنگِ مرمر کے یہ پانی پیچھے ہٹنے کی بجائے کلیسا کے پہلوؤں میں سے باہر نکلنے کے بعد دوسری جانب پھر رواں دواں تھے میں بھی اس دیوار سے پہلو بچا کر المنصور کے حصّے کی جانب چلا گیا۔ مسجد کے اندر دوبارہ میں تعمیر کردہ ایک چیپل کی سلاخوں کو تھامے ایک پادری نے اس ویران حصّے میں میرے قدموں کی آواز سن کر سر اُٹھایا اور پھر سینے پر صلیب کا نشان کھینچ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کلیسا میں صبح کی سروس تو تمام ہو چکی میرے بیٹے۔ تم دیر سے پہنچے ہو" اس نے انگلی کے اشارے سے ایک صلیب مجھ پر بھی لاد دی۔

"مقدس باپ! میں تو سیاح ہوں۔ مسجد کی زیارت کے لیے آیا ہوں" میں نے صلیب کے بوجھ تلے دبتے ہوئے کہا۔

"پھر تم بہت پہلے آگئے ہو۔ ہم اس مسجد کی...... اس کلیسا کی برقی روشنیاں تب تک نہیں جلاتے جب تک سیاحوں کی ایک معقول تعداد اندر نہ آجائے" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر گلے میں لٹکی وزنی صلیب کو مُٹھی میں بھینچ کر آہستہ سے بولا "تم مُور ہو؟"

وارث شاہ نے سرگوشی کی "اساں ذات صفات تے بھیس کیہا؟"

ادھر لی یُو تانگ بھی مجھے مُرتد بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ "سیاحت کا حقیقی مقصد اپنی ذات، پیشے، وطن اور مذہب کو فراموش کر کے ایک عام انسان بن جانا ہے۔"

میں وارث اور یُو تانگ کا کہنا ماننے کو تھا کہ شاہ حسین فقیر نمانے نے فریاد کی۔

"رانجھن سانوں کُنڈیاں پائیاں دل وچ لگیاں شورو۔ مچھی وانگوں میں پئی تڑفاں تا در مے ہتھ ڈور" اور میں نے اقرار کر لیا۔ "ہاں میں مُور ہوں۔"

"افریقہ سے آئے ہو؟" اُس نے صلیب کو مُٹھی سے آزاد کر کے ہاتھ چوغے کی جیبوں میں اُتار دیے۔

"پاکستان......"

"ہوں! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں بھی مُور رہتے ہیں......" اُس نے سر ہلا کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ "آؤ میں تمہیں اس عمارت کا خوبصورت ترین حصّہ دکھاؤں۔"

میں ایک فرمانبردار طالب علم کی طرح سر جھکائے اُس کے پیچھے ہو لیا اور ہم دونوں ستونوں کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے مسجد کے ایک ایسے حصّے میں آگئے جس کی چھت لکڑی کی بجائے سفید پلستر کے شہتیروں سے بنی ہوئی تھی ستونوں سے اُوپر اُٹھتی ہوئی محرابوں کا ایک سلسلہ تھا جن پر دیدہ زیب پھول بُوٹے نقش تھے۔ ستونوں کے درمیان میں سے نیم تاریکی کے باوجود الحکم کی تعمیر کردہ محراب چمکتے ہیرے کی طرح یوں روشن نظر آرہی تھی جیسے پوری عمارت کی تمام روشنی کھینچ کر اس میں جذب ہو رہی ہو۔ اگر مجھے دنیا کی خوبصورت ترین مسجدوں کے درمیان مجموعی طور پر موازنہ کرنا پڑے تو شاید مجھے مسجد قرطبہ کو سلطان احمد استنبول، مسجد جامع ہرات اور مسجد گوہر شاد مشہد کے مقابلے میں ترجیح دینے پر قدرے تامل ہو مگر مسجد قرطبہ کی محراب الحکم میرے نزدیک دنیا کی تمام عمارتوں کے کسی بھی انفرادی حصّے پر

صناعی اور خوبصورتی کے لحاظ سے حاوی ہے۔ سفید سنگِ مرمر کے مستطیل منقش مُصلّے
صورت فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ میرے راہبر پادری نے مُصلّے کے قریب رکھی
ایک اَدھ جلی موم بتی اُٹھا کر روشن کی اور محراب کے اندر داخل ہو کر اُسے بُلند
کر دیا۔ آیاتِ قرآنی اور خوشنما نقش و نگار جو اس سے پیشتر ایک ٹھوس اور جامد
صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔ لاکھوں چھوٹے چھوٹے چمکتے دمکتے مختلف
رنگوں کے پتھروں میں منتشر ہونے لگے۔ خطِ کوفی میں تحریر آیاتِ قرآنی کا ایک
ایک نقطہ دال کے دانے جتنے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے جوڑنے سے
ظاہر ہُوا تھا۔ پُر پیچ پھول اور مرصع حاشیے بھی انہی رنگا رنگ ٹکڑیوں کے
باہم ربط سے وجود میں آئے تھے۔ موم بتی کی جھلملاتی روشنی میں ان کا سنہرا رنگ سینکڑوں
برس گزرنے کے باوجود آنکھوں کو خیرہ کیے دیتا تھا۔ چھت سے وہ خالی رسّی لٹک
رہی تھی جس کے سرے پر مسجد کا سب سے بڑا فانوس بندھا ہوتا تھا۔ یہیں پر
ماہِ رمضان کے شروع میں وہ بھاری بھر کم موم بتی روشن کی جاتی جس کا حجم اتنا
نپا تُلا ہوا کرتا تھا کہ عین آخری روزے کے افطار کے وقت خود بخود بجھ جاتی تھی۔
پادری نے موم بتی کو ایک دائرے کی صورت میں حرکت دی۔ محراب میں سے
شرارے پھُوٹ پھُوٹ کر بکھرتے اور پھر اُسی لمحے سمٹ کر خطِ کوفی اور نقش و نگار میں
جذب ہونے لگتے۔

"پچی کاری کا یہ کام اس لحاظ سے دنیا بھر میں منفرد ہے کہ اس سے زیادہ
چھوٹے پتھر کسی اور عمارت کی تزئین کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔"

"کیا یہ مُوروں کے کمالِ فن کا معجزہ نہیں کہ بارہ سو برس پیشتر تعمیر کردہ اس
محراب میں سے ابھی تک پچی کاری کا ایک ٹکڑا بھی نہیں اُکھڑا......"

"اُکھڑتے رہتے ہیں......" اس نے موم بتی بُجھا کر فرش پر رکھ دی لیکن
ہمارے آثارِ قدیمہ کے ماہر انھیں دوبارہ اُسی ترتیب سے جوڑ دیتے ہیں۔ یُوں

بھی پچی کاری کا یہ شاہکار عیسائی کاریگروں کے کمالِ فن کا معجزہ ہے۔ شاہِ قسطنطنیہ
نے خصوصی طور پر اس محراب کی آرائش کے لیے پینتیس ٹن وزنی موزیک پتھر
کے ٹکڑے الحاکم کو بطورِ تحفہ روانہ کئے تھے۔ موزیک کے ہمراہ ایسے کاریگر بھی آئے
جو پچی کاری کی بازنطینی روایت کے ماہر تھے۔ اسی لیے نقش و نگار میں واضح طور
پر بازنطینی رنگ جھلکتا ہے......"

"آپ درست ہی فرماتے ہوں گے" میں نے خطِ کوفی کے الفاظ پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے متانت سے پُوچھا "لیکن کیا عیسائی کاریگروں نے یہ آیاتِ قرآنی
بھی......"

پادری نے مجھے اپنی بوڑھی آنکھوں سے یُوں گھورا جیسے کہہ رہا ہو ایک تو
میں تمہیں مفت میں مسجد کی سیر کروا رہا ہوں اور اُوپر سے جرح کرتے ہو؟

"اُن دنوں عربی صرف مسلمانوں کی زبان ہی نہیں تھی" وہ میرے کندھے پر
ہاتھ رکھ کر دھیمے لہجے میں بولا "ہسپانوی عیسائیوں کی بھی مادری زبان تھی....ہاں
یہ ہو سکتا ہے کہ نقش و نگار بازنطینی عیسائیوں نے تخلیق کئے ہوں اور تمہارے
قرآن کی عبارت مُوروں نے خود لکھی ہو۔ ویسے اس مسجد میں جو کچھ بھی تم دیکھ
رہے ہو اس کا صرف بیس فیصد حصّہ اصل حالت میں ہے۔ یہ ساری عمارت
حکومتِ ہسپانیہ کی عنایت سے قائم ہے ورنہ کبھی کی کھنڈر ہو چکی ہوتی۔ خاص طور
پر فرش، چھتیں، باہر کے دروازے اور محرابیں ماہرِ تعمیر ولاسکز باسکو نے عمر بھر
محنت کر کے از سرِ نو تعمیر کروائی تھیں۔"

اپنے ناکافی علم کی بنا پر میں نے لاٹ پادری سے بحث میں اُلجھنا مناسب
نہ سمجھا اور خاموشی سے اُس کی وہ رٹی رٹائی تقریر سننے لگا جو شاید پچھلے پچاس
برسوں سے وہ مسجد میں ہر آنے والے سیاح کے سامنے اس انداز سے کرتا تھا
جیسے ابھی ابھی اُس کے ذہن میں یہ تمام حقائق وارد ہو رہے ہوں۔

"عربوں کے زمانے میں مسجد اور شاہی القصر کے درمیان ایک زیرِ زمین گذرگاہ تھی جس کے راستے خلیفۂ وقت یہاں نماز کے لیے آتا تھا۔ اسی محراب کے دائیں ہاتھ کا مُصلّےٰ خلیفہ کے لیے مخصوص تھا۔ بائیں جانب وزیرِ اعظم بیٹھتا اور ان دونوں کے درمیان امامِ مسجد کے لیے جگہ ہوتی۔ وہ لوگ علمِ ہندسہ کے ماہر تھے۔ محراب کی چھت میں قوسیں، کمانداراُبھرے ہوئے خطوط اور گہرائیاں اس ہندسی ترتیب سے تعمیر کی گئی تھیں کہ خلیفۂ وقت جب مُوذّن کے مقدس دن جمعہ کا خطبہ پڑھاتا تو اس کی آواز ان قوسوں سے ٹکرا کر گہرائیوں میں اُترتی، دوچند ہوکر کماندار خطوط سے چھُوتی اور پھر محراب میں متعدد بار گردش کرنے کے بعد کئی سوگنا بلند ہوکر باہر نکلتی اور پوری عمارت میں پھیل جاتی۔ مسجد میں موجود تیس ہزار سے زائد عبادت گزار چاہے وہ المنصور کے حصے میں ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں۔ اس گونجتی ہوئی آواز کو بخوبی سُن لیتے...... اگر تم پسند کرو تو بے شک محراب کے اندر کھڑے ہوکر مُوذّنوں کی طرح اذان دے کر تجربہ کرلو......"

میں یکدم چونک گیا۔

ایک چھ سالہ بچہ ننھے منے ہاتھ سینے پر باندھے مسجد تاجے شاہ کی پھٹی ہوئی چٹائی پر کھڑا بہ آوازِ بلند نماز دہرا رہا ہے۔ زیر زبر کا فرق آیا، زبان اٹکی، جھکنے میں تاخیر ہوئی اور امامِ مسجد کا لچکیلا بید اُس کی پشت پر بُری طرح برسنے لگا۔ شدید اذیت اور جلتے ہوئے درد کے باوجود حکمِ نماز ہے۔ نیت توڑنا کفر ہے۔ وہ ہچکیاں لیتا ہُوا بھرائی ہوئی آواز میں نماز جاری رکھتا ہے۔ لبریز آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہتے آنسو سینے پر باندھے ہاتھوں پر متواتر گر رہے ہیں۔ اس متشدد ابتدائی تعلیم نے اُسے ہمیشہ کے لیے مذہب سے خوف زدہ کر دیا۔ ذی شعوری کی عمر کو پہنچ کر بھی کسی مذہبی شخصیت کی موجودگی اُسے دہشت زدہ

کرکے پھر سے چھ سالہ بچہ بنا دیتی۔ لاشعوری طور پر جسم کے اجسام چکتے اور بید کی ضربوں کے تکلیف دہ نشان یکلخت اُبھر آتے...... اور اب یہ پادری اُسے اُس مُصلّے پر کھڑے ہوکر اذان دینے کے لیے کہہ رہا تھا جہاں یحییٰ بن یحییٰ الحکم کو مواعظِ حسنہ کیا کرتا تھا۔ ابنِ رُشد، ابنِ زیدون، ابنِ حزم، ابنِ عمار ایسے کمالِ فن رموزِ عالم پر موشگافیاں کیا کرتے تھے اور اذان تو کیا اس کی یادداشت عید کی دو رکعت نماز ادا کرتے وقت بھی ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ اس کا بدن ہمیشہ ایک شڑکتے ہوئے بید کی آمد کا منتظر رہتا۔ کہیں وہ امامِ مسجد میرے پیچھے تو نہیں چلا آیا تھا؟ میں نے پہلے اردگرد دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ میں مسجد قرطبہ میں ہی کھڑا ہوں، آج سے چوبیس برس پیشتر مسجد تاجے شاہ میں تو نہیں ہوں اور پھر آہستہ سے جواب دیا۔ سوری...... مجھے اذان یاد نہیں۔"

"اور تم مُوذّن ہو......" پادری کا پوپلا منہ حیرت سے لٹکا اور کسی کھرپڑی کے جبڑے کی طرح کھُل گیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔

"تو سنو" اُس نے صلیب کو چُوما اور پھر ہونٹوں کے گرد ہتھیلیوں کا ہالہ بنا کر انتہائی عقیدت سے بلند آواز میں پکارنے لگا...... آ...... آ...... آواز محراب کے اندر پتھر میں کُندے نیم دائروں سے ٹکرائی...... قوسوں نے اس آ...... آ...... کو دوچند کرکے کماندار خطوط پر پھیلا دیا۔ پادری کا منہ پوری طرح کھل گیا...... وے...... وے...... ماریا! چھت کی پیالہ نما گہرائیوں میں ڈوب کر "آوے ماریا" کے الفاظ نیچے اُترے اور محراب میں سے نکل کر مسجد کے ایک ہزار ترانوے ستونوں کے گرد منڈلاتے ہوئے پوری عمارت میں گونجنے لگے...... آوے ماریا! آوے ماریا!

جب بنو اُمیّہ کا آخری تاجدار مروان مصر کے ایک گاؤں میں تنِ تنہا منہ میں اپنی سفید ریش دبائے عباسی سپاہیوں کی تلواروں کو اپنے عمر رسیدہ بدن پر روک

رہا تھا تو اس کا بیس سالہ پوتا عبدالرحمٰن دریائے فرات اور کوہِ اطلس کے درمیان ایک معز و ملزم کی مانند عباسیوں کے سیاہ پرچموں کے سائے اور ان کے پُرشوق خنجروں سے ہراساں کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں وہ اس خونی طوفان کے تھم جانے تک روپوش رہ سکے۔ پانچ سال کی صحرانوردی کے بعد آبلہ پا عبدالرحمٰن افریقہ پہنچا جہاں اس کی ماں کے رشتہ دار بربر قبیلے نے اسے اپنی امان میں لے لیا۔ عبدالرحمٰن کی عقاب نظروں نے دیکھ لیا کہ سمندر پار کا اندلس اس کے لیے بنو اُمیہ کی کھوئی ہوئی سلطنت کا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ چند بربر قبیلوں اور اپنے غلام بدر کے ہمراہ اندلس کے ساحل پر اُترا اور فرمانروائے اندلس یوسف الفہری کو ایسی شکستِ فاش دی کہ اس کے بعد ہسپانیہ کے جس حصے میں بھی نیزے پر بندھا عبدالرحمٰن کا سبز عمامہ پرچم کی صورت میں افق پر اُبھرتا وہاں کے تاجدار قریش کے اس عقاب کے جھپٹنے سے پیشتر ہی میدان چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ دراز قد۔ اکہرے بدن کا مالک عبدالرحمٰن جس کے ماتھے پر ہمیشہ سُرخ بالوں کی دو لٹیں کھیلتی رہتی تھیں پورے ہسپانیہ کو زیر کر کے فنونِ لطیفہ کی طرف متوجہ ہُوا۔ اُس کی حسین ترین یاد دمشق میں واقع شاہی باغ رصافہ تھا جہاں وہ بچپن میں اپنے دادا ہشام کے کندھوں پر سوار ہو کر سیر کیا کرتا تھا۔ نئے اموی دارالسلطنت کے مضافات میں اسی نمونے پر رصافۂ قرطبہ کی تعمیر ہوئی۔ یہیں پر عبدالرحمٰن نے اپنے ہاتھوں سے اندلس میں پہلا کھجور کا درخت لگایا۔ اپنے کھوئے ہوئے دمشق کی علامت اس صحرائی درخت کو دیکھ کر اس نے وطن سے دوری کی کسک کو جن اشعار میں ڈھالا وہ آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔

رصافہ کی تعمیر سے بھی قرطبہ دمشق کے ہم پلہ نہ ہو سکا کہ دنیا کے اس قدیم ترین شہر میں ایک ایسی عمارت کھڑی تھی جس کے میناروں اور گنبدوں کی محبت امیر عبدالرحمٰن

الداخل کے اُموی خون میں دوڑ رہی تھی۔ اُس کے اسلاف کی یادگار مسجدِ اُمیہ......!

قرطبہ شہر کے درمیان وادی الکبیر کے کنارے ایک قطعۂ زمین تھا جس کے سینے پر زمانے نے ہمیشہ ایسے درو دیوار بلند دیکھے جنھیں انسان نے اَن دیکھی قوتوں کی عبادت کے لیے وقف کیا۔ سب سے پہلے قوطی مندر تعمیر ہُوا۔ ہسپانیہ پر رُومیوں کا غلبہ ہُوا تو یہاں رُومی معبد بنا دیا گیا۔ عیسائیت کی آمد پر اس کی جگہ کلیسا سینٹ ونسنٹ کی عمارت کھڑی کر دی گئی۔ عبدالرحمٰن نے ایک لاکھ درہم کے عوض یہ قطعۂ زمین عیسائیوں سے حاصل کیا اور مسجدِ اُمیہ دمشق کے مطابق نقشہ بنوا کر ۷۸۶ء میں خود اپنے ہاتھوں سے مسجدِ قرطبہ کی بنیاد رکھی۔ تعمیر کی ذاتی دیکھ بھال کی غرض سے وہ رصافہ کے کھجوروں کے درختوں سے جدا ہو کر قریبی القصر میں آ ٹھہرا اور روزانہ دو گھنٹے عام مزدوروں کی طرح مسجد کی تعمیر کے لیے اینٹیں اور گارا اپنی پُشت پر ڈھوتا۔ اگرچہ مسجد ابھی تک مکمل نہ ہوئی تھی، ہر طرف ملبے کے ڈھیر تھے، پلستر گیلا تھا، نقش و نگار میں رنگ آمیزی باقی تھی کہ عبدالرحمٰن کے دل میں اس خیال کی جڑیں پھیلنے لگیں کہ اُس کا رشتۂ حیات منقطع ہونے کو ہے۔ چنانچہ حکمِ افتتاح جاری ہُوا۔ ملبہ کے ڈھیروں کو پردوں سے چھپا دیا گیا۔ نامکمل فرش پر قالین بچھائے گئے۔ سفید کفتان، سفید عبا اور سفید عمامہ میں ملبوس سرخ بالوں والے عبدالرحمٰن نے اسی محراب میں کھڑے ہو کر خطبہ و نماز کی ادائیگی کر کے مسجدِ قرطبہ کے باقاعدہ افتتاح کی سعادت حاصل کی۔ اس کے چند روز بعد ماردہ کے شہر میں عبدالرحمٰن وفات پا گیا۔ مسجدِ قرطبہ میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ مسجد کی مزید توسیع مختلف ادوار میں ہوئی۔ ہشام اوّل نے مینار تعمیر کروایا۔ عبدالرحمٰن دوم نے محرابوں کی قطاروں کو دوچند کروایا۔ الحکم نے پینتیس ہزار درہم کی لاگت سے منبر و مقصورہ تیار کروایا۔ آخر میں سب سے بڑا اضافہ المنصور کے زمانے میں ہُوا جب کہ مسجد کی

وُسعت چار گنا کر دی گئی۔

پونے پانچ سو برس تک اس محراب سے اللہ اکبر کی آواز اس بے مثال حرم پاک میں گونجتی رہی جہاں اس وقت میرے سامنے ایک پادری منہ کھولے "آوے ماریا" کی صدائیں بلند کر رہا تھا۔ اسی متبرک مقام پر وہ خون آلود قرآن مجید رکھا ہُوا تھا جس کی تلاوت کے دوران حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ یہیں کھڑے ہو کر قاضی المنذر نے امیر اندلس کو محض اس غفلت پر کہ اُس نے نمازِ جمعہ مسجدِ قرطبہ کی بجائے اپنے محل میں ادا کی تھی سب کے سامنے خطبۂ عام میں اتنی سخت تنبیہ کی کہ امیر اندلس کا چہرہ شرم و ندامت سے سُرخ ہو گیا، تاریخ دان المقری نے مسجد قرطبہ کے طرزِ تعمیر اور حُسن کے بارے میں پوری کتاب تصنیف کی۔

"آوے ماریا...... آوے ماریا!" پادری کی رقت آمیز آواز محراب میں ایک بوڑھے گدھ کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔

زمانے کے راہٹ کی ماہل ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔ اس پر بندھے خالی آبخورے عمیق کنوئیں کے تازہ پانی سے لبالب بھر کر روشنی کی جانب مائلِ سفر ہوتے ہیں اور پھر خود بخود ماہل کی حرکت سے بے اختیار ہو کر جھکتے جھکتے اپنا اثاثہ کھو کر پھر خالی ہو جاتے ہیں۔ ۱۲۳۶ء میں مسلمانوں کی عظمت کاروان پانی آبخوروں سے خالی ہو گیا۔ قرطبہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ مسجد کے چند ستون اُکھاڑ کر بیچ میں حضرت مریم کا مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ یہ صورت حال ۱۵۲۰ء تک قائم رہی اور مسجد کسی حد تک اصلی حالت میں موجود رہی۔ پھر قرطبہ کے چند پادریوں نے کارلوس پنجم کو قائل کر لیا کہ کیتھولک ہسپانیہ کے وسط میں مسلمانوں کا ایک معبد عیسائیت کی توہین ہے اس لیے اُسے مسمار کر کے یہاں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کیا جائے۔ کارلوس نے جسے مسجدِ قرطبہ دیکھنے کا

اتفاق نہیں ہُوا تھا اجازت دے دی۔ چنانچہ مسجد کے قلب کو پھوڑا گیا۔ سینکڑوں ستون اکھاڑ دیئے گئے۔ چھت کو اُدھیڑ دیا گیا۔ مسجد کا صرف وہی حصّہ محفوظ رہا جو کلیسا کے نقشے میں شامل نہ تھا۔ خوبصورتی کی اس لاش پر انھوں نے اپنے کلیسا کی دیواریں اُٹھائیں۔ ایک کرخت اور اوچھی عمارت نے گرد پھیلے ہوئے ہجومِ تخیل کو بادِ سموم کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کنول کا جنگل مُرجھا گیا۔

کارلوس جب اپنے معماروں کا عظیم کارنامہ دیکھنے کے لیے اندر داخل ہُوا تو مسجد کے نازک ستونوں کے درمیان دیوزاد بھدا کلیسا دیکھ کر انتہائی پشیمان ہُوا۔ اس نے رسمِ افتتاح ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے پادریوں سے کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم کیا کرنے والے ہو تو تم یہ کبھی نہ کر پاتے۔ کیونکہ جو کچھ تم نے یہاں بنایا ہے وہ کہیں بھی تعمیر کیا جا سکتا تھا اور جو کچھ تم نے تباہ کر دیا ہے وہ رُوئے زمین پر کہیں بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔" جیمز مشنر اس کلیسا کو "عظیم بدصورتی" کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ہٹن اُسے ایک ناقابلِ تلافی جُرم قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ گندا کلیسا ایک ناقابلِ یقین پاگل پن کا مظہر ہے۔ خود نمائی، دکھاوٹ اور بازاری پن کا مظاہرہ۔ ایک ایسی ظالمانہ قربانی.. جو پادریوں نے اپنی مذہبی ہوس کی بھینٹ چڑھا دی۔ یہ عمارت کلیسا سے زیادہ ایک قحبہ خانہ لگتی ہے۔"

"آوے ماریا...... آوے ماریا...... اوّل و آخر فنا...... ماریا...... فنا...... فنا...... فنا!" صدا محراب میں یوں پھڑ پھڑا رہی تھی جیسے کسی تُند خُو عقاب کے گھونسلے میں ایک حیرت زدہ چڑیا داخل ہو جائے۔

سُلطان محمد فاتح بازنطینیوں کو شکست دے کر عیسائیت کے سب سے بڑے معبد سانتا صوفیہ کو مسجد میں بدل دیتا ہے اور آوے ماریا کی بجائے

اس کے گنبد سے اللہ اکبر کی صدا ٹکراتی ہے۔ مسلمان دمشق میں داخل ہو کر کلیسا اعظم کے نصف حصّے کو مسجد قرار دے دیتے ہیں۔ کچھ اسی طرح مسجدِ قرطبہ میں اب اللہ اکبر کی بجائے آوے ماریا کی صدائیں تاریخ کے عروج و زوال کا ایک لازمی حصّہ ہیں جس پر انسانی جذبات کو کوئی اختیار نہیں۔ آبخورے ہمیشہ پانی سے بھرے نہیں رہتے۔ ایک مرتبہ ماہل کا چکر مکمل ہو جائے تو انھیں تہی دامن ہونا ہی پڑتا ہے...... اوّل...... اللہ اکبر...... و آخر...... آوے ماریا...... فنا!

محراب کے گنجے اندھیرے میں خوابیدہ پچّی کاری کے سنگریزے دم ستاروں کی طرح چمکے۔ چھت اور محرابوں کے دامن میں مخفی قمقمے ایک ایک کر کے یوں روشن ہونے لگے جیسے گھنے جنگلوں میں سورج کی پہلی کرن تیرتی چلی جاتی ہے۔ لکڑی کا پھاٹک کھلا اور سیّاحوں کا پہلا ریلا کیمروں اور سیاحتی کتب سے لدا پھندا مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ بھیڑوں کے اس گلّے کا چرواہا گائیڈ ایک ستون پر ہاتھ رکھ کر بے دھیانی سے تاریخی تفاصیل بیان کرنے لگا جیسے چوتھی جماعت کا بچہ بلا سوچے سمجھے ہنک ہنک کر کوئی پہاڑہ سُناتا چلا جاتا ہے۔ پادری نے خاموش ہو کر پیچھے دیکھا اور اُس کے ماتھے پر ناگواری لکیروں کی صورت میں پھیل گئی۔ ان سیاحوں کی آمد سے تقدس کا وہ بندھن ٹوٹ گیا جس نے ہم دونوں کو مختلف مذاہب سے متعلق ہونے کے باوجود اس عمارت سے یکساں جذباتی شدت کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اُس نے میرے گم سُم چہرے پر شکایت آمیز نظریں بچھائیں اور حسبِ عادت میرے سینے پر صلیب لا دکر آہستہ آہستہ چلتا مسجد سے باہر نکل گیا۔

مُووی کیمروں کی گراریاں ایک جھنجھلاتی ہوئی بھنبھناہٹ کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ کلک کلک...... مسجد کے ستونوں کو مقیّد کرنے کے لیے کیمروں کے بٹن دب رہے تھے۔ وقفوں کے بعد فلیش کی ننگی روشنی محرابوں اور ستونوں

کو عُریاں کر کے ان کا تقدّس چھین لیتی۔ فضا میں ہاتھ لہراتا ہُوا گائیڈ مسجد کی خود ساختہ تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے گاہکوں کی تفریحِ طبع کا سامان بھی پیدا کر رہا تھا "اور اس قدیم پتھر پر کندہ عربی عبارت میں اللہ کی پرستش کرنے والوں کو جنّت میں ایسی درجنوں عورتیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک برجی باردو اور صوفیہ لارین سے ہزار گنا خوبصورت اور متناسب جسم کی مالک ہوگی۔"

"میں اسی وقت مسلمان ہو جاتا ہوں۔" ایک گنجے قد کے سیّاح نے اپنی نیکر اُڑستے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اعلان کیا "بس مجھے حُوروں کا خدا یہیں اسی جہاں میں برجی باردو عطا کر دے۔"

"آمین" بقیہ ٹولی نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔

"المنصور نے ٹیکس بڑھا دیئے اور مسجد بھی بڑھا دی۔"

اس مرتبہ ایک امریکی نے اپنے اوپر مصنوعی بیہوشی طاری کر لی اور زیرِ لب بڑبڑایا "اوہ مائی گاڈ! کیا اُن دنوں بھی سٹیٹ ٹیکس ڈیپارٹمنٹ ہُوا کرتا تھا؟"

"اور یہ ہے وہ جگہ جہاں کھڑے ہو کر مُوروں کا پادری اپنے اللہ کو آوازیں دیا کرتا تھا" یہ کہہ کر گائیڈ ایک کان پر ہتھیلی جما کر مصنوعی سنجیدگی سے "اللہ اللہ" چیخنے لگا۔ بھیڑیں اس تماشے سے بے حد محظوظ ہوئیں اور ممنانے لگیں۔ ان میں سے چند محراب کے اندر داخل ہو کر گائیڈ کی رفاقت میں "آلا۔ آلا" کا کورس الاپنے لگیں۔

"اور جناب......" گائیڈ نے اپنا دلچسپ مشغلہ منقطع کرتے ہوئے میرے قریب آ کر کہا "کیا آپ ہماری پُرلطف سیر میں شامل ہونا پسند کریں گے۔ صرف تیس پیسیتے!"

میں نے صرف اُسے نظر بھر کے دیکھا۔ آنکھوں کی سُرخی سے اُس نے میرا جواب پایا اور واپس چلا گیا۔

مسجد کا پھاٹک متواتر کُھلتا اور بند ہو رہا تھا۔ سیاحوں کی متعدد ٹولیاں اندر
آ رہی تھیں۔ ہر سُو بے فکرے اور جذبات سے عاری چہرے تھے جو چار دیواری
سے متصل شراب خانوں سے اُٹھ کر صرف اپنی گائڈ بک پر مسجد قرطبہ کے آگے
"دیکھ لی" کے الفاظ لکھنے کے لیے ادھر چلے آئے تھے۔ اُس کُملائے ہوئے کنول
کے جنگل میں ستونوں کے جُھنڈ میں۔ ہجوم تخیل میں اب بھیڑیوں کی حکمرانی تھی۔
کلک۔ کلک! فلیش فلیش

میں مسجد سے باہر جانے کے لیے پھاٹک کے پاس پہنچا تو کواڑ کُھلا اور وُہ
دراز قد عورت داخل ہو گئی جو پچھلی شب کیمپنگ کے سوئمنگ پُول میں رُوح کی
طرح خاموشی سے تیر رہی تھی...... وُہ مراکو کے روائتی لباس لمبے سفید چوغے
میں ملبوس تھی۔ اُس نے سر اور چہرے کو ایک رُومال سے اس طرح ڈھانپ رکھا
تھا کہ گندمی رنگ کے کینوس پر صرف دو چمکدار اور خوبصورت آنکھیں حرکت
کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ایسی سیاہ تتلیوں کی مانند جو انجانے میں شہد کی تہ
پر بیٹھ جائیں اور پھر پاؤں چمٹ جانے سے بس پھڑپھڑاتی رہیں۔ مجھے یُوں
مقابل پا کر وُہ لمحہ بھر کے لیے رُکی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی وحشت جھلک
رہی تھی۔ ایلپس کے کسی بلند اور دُور افتادہ گاؤں کی طرح جو حُسنِ فطرت کا شاہکار
ہونے کے باوجود اپنی ویرانی اور سناٹے سے دل میں ایک سرد خوف بھر دیتا
ہے۔ بوڑھی خادمہ حسبِ معمول چمڑے کا تھیلا دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے
اُس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اُس نے جُھک کر عورت سے کچھ کہا اور وہ دونوں
معدوم ہوتی ہوئی گُونج کی طرح مسجد کے ستونوں میں گُم ہو گئیں۔

صحنِ مسجد میں اب خُوب رونق تھی۔ نارنگیوں اور سرو کے درختوں تلے
مسجد کے نواحی علاقوں میں کام کرنے والے مزدور دوپہر کے کھانے کی پوٹلیاں

پھیلائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ فوارۂ زیتون کی دھار کے نیچے ایک مٹکا دھرا
تھا اور منڈیر پر بیٹھی ایک بڑھیا تالاب میں ڈبکیاں لگاتے متعدد بچوں کو چھینٹے اڑانے
پر سرزنش کر رہی تھی۔ ٹکٹوں کی کیبن کے گرد سیاحوں کا ہجوم تھا۔ محافظ کا ہاتھ
ردھم و لوچ و دبوچ کر ٹکٹ جاری کر رہا تھا۔ مسجد کی زیارت سے فارغ ہو جانے والے
سیاح اِدھر اُدھر بنچوں پر براجمان تصویری پوسٹ کارڈوں پر اپنے تاثرات
قلمبند کر رہے تھے۔ صحن کے طویل برآمدوں میں ایک ہسپانوی جوڑا بہت دیر
سے چھت کے نقش و نگار سراہنے کے بہانے کسی ایسے کونے کی تلاش میں
تھا جہاں وہ مخل ہوئے بغیر عبادتِ عشق کے ابتدائی مکالمے سکون سے ادا کر سکے۔
بڑھیا کا مٹکا لبریز ہوا تو میں نے فوارۂ زیتون کی ٹھنڈی دھار سے اپنے تمتماتے
چہرے کو تر و تازہ کیا اور پھر باب التوبہ سے باہر آ گیا۔

صحن کے برعکس چار دیواری کے گرد لپٹی سڑک سنسان پڑی تھی۔ باب التوبہ کے
پہلو میں عبدالرحمٰن سوئم کی یاد میں ہسپانویوں کے تعمیر کردہ پتھریلے چبوترے پر
ایک چیل بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب پہنچنے پر اس نے پَر پھیلائے اور ایک ہی اُڑان
میں مینارِ مسجد کی چوٹی پر سینٹ رافیل کے سر پر جا براجمان ہوئی۔ یادگار سے
پرے دیوار کی گود میں "پھولوں کی کنواری مریم" کا چیپل دکھائی دے رہا تھا۔
بی بی مریم کے پاؤں میں سوکھے ہوئے پھولوں کا ایک ڈھیر تھا۔ میں نے پوری
عمارت کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لیے دیوار کے ساتھ ساتھ پیدل چلنا شروع
کر دیا۔ بائیں ہاتھ پر دستی مصنوعات کی دکانیں تھیں جن میں سے بیشتر کے دروازوں
پر "قیلولے کے لیے بند ہے" کی تختیاں لٹک رہی تھیں۔ ان سے پرے مُورش
طرزِ تعمیر کی حویلیوں کی چھتوں پر شاہی القصر کے سنگلاخ در و دیوار کے سائے تھے۔
میں دیوار کے جس حصے کے قریب چل رہا تھا اس میں جا بجا وُہ بند دروازے
دکھائی دے رہے تھے جو پہلے القصر کی جانب کھلتے تھے۔ مسجد کے اندر چونکہ ان

دروازوں کے پیچھے چھپا تعمیر کر دیئے گئے ہیں۔ اس لیے ان کی بناوٹ کا اندازہ صرف باہر سے ہی ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک آدھ کے سوا باقی تمام دروازے ابتدائی نقشے کو سامنے رکھ کر از سرِ نو تعمیر کیے گئے ہیں۔ پورتا اد کسنیڈل کی زیبائش تو بالکل حال ہی میں ہوئی ہے۔ البتہ پورتا استبان اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ دروازہ ابھی تک ابتدائی حالت میں قائم ہے۔ سرخ و سفید نعل نما محراب کے دونوں طرف جالیاں ہیں۔ کہیں کہیں پیچیدہ نقش و نگار کی حامل پتھر کی سلیں ہاتھ لگانے سے یوں لرزتی ہیں جیسے قدامت کا یہ بوجھ اب ان سے زیادہ دیر نہ اٹھے گا۔ پلستر اکھڑ چکا ہے اور سلوں کے درمیان منہ کھولے شگافوں میں سے خود رو گھاس جھانک رہی ہے۔ ہر سال بارش کا پانی ان شگافوں کو مزید گہرا کر دیتا ہے اور اس عمارت میں استعمال ہونے والی سرخ مٹی گھل گھل کر وادی الکبیر کے پانیوں میں جا ملتی ہے۔ ایک اور دروازہ پورتا اور رفیئل اس سے بھی زیادہ شکستہ حالت میں ہے۔ پلستر کی غیر موجودگی میں سرخ اینٹیں ایک ڈھانچے کی ہڈیوں کی طرح عمارت کے جسم میں سے ابھری ہوئی ہیں۔ میں نے ایک دراڑ کی مٹی کریدی اور دو تین اینٹیں بھربھرے پلستر کی بارہ سو سالہ رفاقت سے جدا ہو کر میرے قدموں میں گر گئیں۔ مجھے خیال آیا شاید انہی تین اینٹوں کو امیر عبدالرحمٰن نے خود دیوار پر جمایا ہو، ان کے درمیان اس سرخ مصالحے کی تہہ اپنے ہاتھوں سے ہموار کی ہو۔ میں نے جیب میں سے رومال نکال کر پوروں سے چمٹے سرخ ذرے یوں صاف کیے جیسے ارتکابِ جرم کے بعد شواہد مٹائے جاتے ہیں۔ رنگ اتنا سرخ تھا، کہ سفید رومال لہولہان ہو گیا۔ مسجد کا جو حصہ وادی الکبیر کی جانب ہے اس کی دیوار بقیہ چار دیواری سے تین گنا اونچی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح بادشاہی مسجد لاہور کی شمالی دیوار اس لیے زیادہ گہری رکھی گئی

تھی کہ اس کے پہلو میں دریائے راوی بہتا تھا، اسی طرح مسجدِ قرطبہ کی اس بلند دیوار کے ساتھ ان دنوں وادی الکبیر کے پانی رواں تھے۔

انسانی جسم کی ضروریات اگر متوازن طریق سے پوری ہوتی رہیں تو وہ ایک بے دام غلام کی طرح آپ کی خواہشوں کا ساتھ دیتا ہے مگر آج صبح سے روحانی غذا کا پلڑا کچھ یوں جھکا رہا کہ جسمانی غذا کی ضرورت ذہن سے اتر گئی لیکن ٹانگوں نے اس کی فراہمی کے بغیر نقوشِ کہنہ کا مزید طواف کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"کوریدا" کی چھت سے ہسپانیہ کے دیگر قہوہ خانوں کی مانند گرم مسالوں سے محفوظ شدہ سؤروں کی تھوتھنیاں اور گرانڈیل رانیں لٹک رہی تھیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح بل فائٹنگ کے پرانے پوسٹر بھی نوادرات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں مٹیالی دیواروں پر چسپاں پوسٹر خانہ جنگی سے پہلے کی بل فائٹوں کا اعلان کر رہے تھے۔ کاؤنٹر کی سطح پر دستک سے قہوہ خانے کا مالک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ چند کرسیاں جوڑ کر ان پر بحالتِ قیلولہ میں دراز تھا۔ غنید کے نزول میں اچانک مداخلت پر اس کے چہرے پر جو ناگواری ظاہر ہوتی وہ ایک گاہک کا چہرہ دیکھ کر فی الفور باطن میں جذب ہو گئی اور اس نے حسبِ منشا مجھے گازپاچو سوپ کا پیالہ اور ایک لمبی ڈبل روٹی مہیا کر دی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ڈائری کے اوراق پر اپنے تاثرات اتارنے کا عمل شروع کیا مگر قہوہ خانے کی سکون آمیز نیم تاریک فضا مجھ پر غالب آ گئی اور میں وہیں چپکے ہوئے صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر اونگھنے لگا۔ جب آنکھ کھلی تو چھت سے لٹکے جانور سگریٹ کے دھوئیں میں ڈوبے نظر آئے۔ انگلستان کے دیہات کی کہر آلود صبح میں ٹھٹھرتے مویشیوں کے کسی گلے کی طرح۔ قہوہ خانہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر گرم گرم کافی کے چند گھونٹ بھرے

اور دہلیز پار کر کے باہر آ گیا۔

سورج ڈھل چکا تھا۔ باب التوبہ بند ہو چکا تھا۔ ایک پادری مچھروں والی مریم کے آگے مجھکا موم بتیاں روشن کر رہا تھا۔ دیوارِ مسجد کے سائے میں آراستہ پیراستہ بگھیوں کی ایک قطار تھی۔ بگھی بان جو بُل فائٹروں کے بھڑکیلے لباس میں جکڑے ہوئے تھے، گھوڑوں کی باگیں تھامے قریب سے گزرتے ہر سیاح کو قرطبہ کی خوبصورت ترین بگھی میں سوار ہو کر عرب محلے کی سیر کی دعوت دے رہے تھے۔ دستی مصنوعات کی دکانیں بھی کھل چکی تھیں۔ عربوں کے عہد میں قرطبہ نے چمڑے کی صنعت میں اتنا عروج حاصل کیا کہ چمڑے کو صرف "قرطبین" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ یہ لفظ آج بھی مستعمل ہے۔ مسجد کے سامنے اُن دکانوں میں زیادہ تر "قرطبین" سے بنی ہوئی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں۔ میں دیوارِ مسجد کے سائے میں دریائے وادی الکبیر کی جانب اُترنے لگا۔ پورٹا او دختیل میں سے اُکھڑی ہوئی وہ سُرخ اینٹیں ابھی تک فٹ پاتھ پر پڑی تھیں جنھیں آج دوپہر میرے لمس نے اُن کے قدیم مسکن سے جُدا کر دیا تھا۔

مسجد کی شمالی دیوار کے قریب پورتا ڈل پوئینتے کی بلند مگر بدصورت رُومی محراب "گہرے پانیوں کے دریا" وادی الکبیر کے کنارے کھڑی تھی۔ یہ محراب اُس رُومی پل کے نکتۂ آغاز پر واقع ہے جسے ہشام نے ناربون (فرانس) کی فتح کے بعد مالِ غنیمت سے از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔ پل کی رسمِ افتتاح کے موقع پر ایک فقیہہ نے الزام لگایا کہ چونکہ اس سے پیشتر ہشام کو شکار کے لیے شہر سے باہر نکلنے کے لیے ایک دُور افتادہ پل تک جانا پڑتا تھا اس لیے اُس نے القصر کے سامنے یہ پل رعایا کی بہبود کی بجائے صرف اپنے ذاتی فائدے کی خاطر بنوایا ہے۔ ہشام نے فقیہہ کے الزام کا جواب یوں دیا کہ پوری زندگی اس پل پر قدم نہ رکھا...... بہرحال میں نے اس پل پر قدم رکھا۔ پل کی دیوار پر الیتاوہ سینٹ رافیل

کے مجسمے تلے جلتی موم بتیوں کی روشنی میں میلتا وادی الکبیر کی پہنائیوں میں جھانکتا دوسرے سرے پر پہنچا جہاں قلعہ ہورا نام کا ایک حفاظتی بُرج کھڑا ہے۔ عرب عہد کے اس خوشنما بُرج میں ان دنوں کوئی الا بلا قسم کا عجائب گھر قائم ہے۔

میں قلعہ ہورا سے گزر کر دریا کے کنارے کنارے ایک نیم پختہ ویران سڑک پر ہو لیا جس کے دائیں جانب اُجاڑ ٹیلوں پر گھاس پھونس اور خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور بائیں طرف دریا کا حفاظتی بند تھا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں دریا کی سطح تک جاتی سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور ریتلے کنارے پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگا لیا۔ شام کے دھندلکے میں قرطبہ کے بام و در ازمنۂ وسطیٰ کے کسی شہر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی قدیم عمارتوں پر شفق ایک سرخ بادل کی طرح اُمڈ کر ٹھہری ہوئی تھی۔ بارہ سو برس پیشتر اگر کوئی کاروان سرِشام شہر کے قریب پہنچتا ہو گا تو دھندلکے میں مدھم مدھم روشن قرطبہ اسی طور ایک ساکت تصویر کی صورت دکھائی دیتا ہو گا۔ دریا میں پانی کی کمی کی وجہ سے سطح پر چھوٹے چھوٹے جزیرے اور ٹاپو اُبھرے ہوئے تھے جن پر جنگلی جھاڑیوں کے پہلو بہ پہلو دھنیا اور پینگ کے پھول بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جزیرے پر چند عورتیں دن بھر کے دھوئے ہوئے کپڑوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک بچہ پانی میں ہاتھ ڈالے تہ سے سنگریزے تلاش کر رہا تھا۔ حسبِ منشا کوئی گول پتھر ہاتھ آتا تو وہ اُسے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی ماں کے ہاتھ میں تھما دیتا جو اسی لمحے اس کی نظر بچا کر واپس پانی میں پھینک دیتی۔ جزیروں کے درمیان رواں پانیوں میں کبھی کبھار کوئی مچھلی اُچھلتی، شفق کی زد میں آتے ہی سُرخ ہو جاتی اور پھر فضا میں تیرتی ہوئی شڑاپ سے نیچے گر جاتی۔ جا بجا اُبھرے جزیروں کو چھوتا ہوا دریا کا آہستہ رَو پانی شام کے سکوت میں ایک متواتر سرسراہٹ کو جنم دے رہا تھا۔ ایک مدھم سرسراہٹ جو زریاب کے نغموں کی

طرح فضا میں پھیل رہی تھی۔

ہارون الرشید کی ایک محفل میں جب نوجوان زریاب نے سُر کی دیوی کو یوں زیر کیا کہ اپنے اُستاد اسحاق موصلی کو بھی پیچھے چھوڑ گیا تو اسحاق کے قہر سے بچنے کی خاطر اس نے بغداد کو چھوڑنے میں ہی عافیت جانی۔ عبدالرحمٰن سوئم بذاتِ خود فصیلِ قرطبہ کے باہر اُس کے استقبال کو آیا۔ شاہی محل کی چابیاں دس روز کے لیئے زریاب کے حوالے کر دی گئیں تاکہ وہ اتنے طویل سفر کے بعد مکمل آرام کرے اور تازہ دم ہو کر دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ زریاب نے فنِ موسیقی کے علاوہ اُندلسی رہن سہن کے آداب کو بھی نئی قدروں سے روشناس کیا۔ اُس نے کپڑے کی بجائے چمڑے سے تراشیدہ دستر خوان اور دھات کی بجائے چینی کے ظروف کو فروغ دیا۔ اُسے اپنے زمانے کا فیشن ڈیزائنر کرسچین ڈیور کہیے جو موسمِ بہار اور موسمِ سرما کے اوائل میں آئندہ چھ ماہ کے لیے بالوں کے نئے سٹائل اور لباس کی جدید وضع قطع کا اعلان کرتا تھا جو پورے اُندلس میں رواج پا جاتے۔ زریاب کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ اُسے دس ہزار سے زائد غزلیں زبانی یاد تھیں۔ اُس کی دو لونڈیاں غزالان اور ہُندلنے صرف اس لیے شہرت پائی کہ وہ ان شعروں کو لکھنے پر مامور تھیں جو حالت خواب میں زریاب پر وارد ہوتے تھے۔

جزیروں اور ٹاپوؤں کے درمیان تین آسیب زدہ پن چکیاں یوں براجمان تھیں جیسے چند دیر زاد پرندے سستانے کی خاطر پانی میں اُترے اور پھر اُن کے پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ ان بوسیدہ پن چکیوں میں سے صرف ایک کی چرخی قائم ہے مگر آبخوروں سے خالی جیسے انگور کے خوشے سے دانے اُتر جائیں تو وہ بے نام ہو جاتا ہے۔ مدتوں ان پن چکیوں نے وادی الکبیر کے پانیوں سے قرطبہ کے پاتیوں اور باغوں کو سیراب کیا۔ پھر چرخیاں تھم گئیں تاریخ کی بال رک

گئی۔ آبخورے پانی سے خالی ہو گئے۔ ان میں سے ایک کو جو غالباً القصر کے سامنے ہے قاضی ولی محمد نے رواں حالت میں دیکھا تھا۔ مقامی باشندے ان پن چکیوں کو مالیبوز کے نام سے پکارتے ہیں۔

میری بلائنڈ ڈیٹ۔ قرطبہ! نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ دریا کے پار اس بزرگ شہر کے افقی خطوط کے حُسن کی اوس دھیرے دھیرے پیاس کے بھانبڑ کو سرد کر رہی تھی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر لبِ دریا ایک خورشکستہ پن چکی کی شکستہ عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ تجسس نے میرے قدموں کو ٹھوکا دیا اور میں ایک ایسی پتھریلی پگڈنڈی پر ہو لیا جس کے اختتام پر پن چکی کے پیٹ میں نصب ایک ادھ کھلا کواڑ نظر آ رہا تھا۔ یہ راستہ پن چکی سے پانچ چھ گز ادھر ہی ختم ہو گیا۔ درمیان میں ایک مختصر ٹکڑے پر پانی رواں تھا۔ میں نے اپنے بوٹ اتار کر بغل میں دابے۔ پتلون گھٹنوں تک اوپر چڑھائی اور وادی الکبیر کی اس شاخ کو عبور کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کرم خوردہ کواڑ ہاتھ لگاتے ہی کھُل گیا۔ میں نے اندر جھانکا۔ آبخوروں سے خالی ایک طویل ہال کسی مردہ اژدہے کی مانند ایک دیو ہیکل چرخی پر لٹکی ہوئی تھی۔ خستہ سیڑھیاں سرکتی ہوئی نیچے گہرائی تک جا رہی تھیں۔ پہلے خیال آیا کہ اے برادر! ایک تو ادھر مسجدِ قرطبہ کی دیوار کا ایک حصہ ڈھا کر چلے آئے ہو اور اب اگر اس سیڑھی پر قدم رنجہ فرماؤ گے تو شاید اس عہدِ رفتہ کی یادگار پن چکی کو بھی لے ڈوبو گے۔ پھر ڈھارس بندھی کہ اگر یہ عمارت سینکڑوں برس سے یونہی قائم ہے تو اب اس ناچیز کے گناہوں کے بوجھ تلے تو مسمار ہونے سے رہی۔ میں نے اندر قدم رکھا اور بے حد احتیاط سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ پن چکی کی نچلی منزل میں سے شاید رومی پل کی جانب کوئی کھڑکی کھلتی تھی کیونکہ زیریں حصے میں ابھی تک سرخی مائل روشنی کا ایک ٹکڑا پناہ گزین تھا۔ ایک انتہائی ٹوٹی پھوٹی

سیڑھی پر قدم رکھنے سے پیشتر میں نے دیوار کا سہارا لیا تو میری ہتھیلی کے بوجھ سے پلستر کی ایک تہہ اُکھڑی اور پھر اس کے پیچھے ایک سرسراتا ہوا چوکور پتھر کھسک کر نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہرائی میں سے ایک ایسی دلدوز نسوانی چیخ برآمد ہوئی کہ میرا تو کلیجہ دہل گیا۔ اگر سیڑھیوں کی شکستگی کا خیال نہ ہوتا تو میں بلاشبہ قلانچیں بھرتا ہوا پن چکی سے باہر نکل جاتا۔ میں کچھ دیر حواس باختہ اُسی حالت میں بُت بنا کھڑا رہا اور پھر ہمت کر کے نیچے جھانکا۔ پن چکی کی تہہ میں وادی الکبیر کی سطح کے متوازی ایک کھڑکی کے قریب جہازی سائز کے میکسیکن ہیٹ کو ہاتھوں میں تھامے ایک لڑکی انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اُوپر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہیٹ پر رکھی انگلیاں دہشت سے لرز رہی تھیں اور اس کا چہرہ شفق کی سُرخ روشنی میں بھی زرد نظر آ رہا تھا۔ دیوار میں سے کھسکا ہوا بلکہ کھسکایا ہوا بھاری پتھر اُس کے بالکل قریب پڑا تھا۔ یعنی میں سنگساری کا مرتکب ہوتے ہوتے بچا تھا۔

"سوری" میں نے ہاتھ ہلا کر افسوس کا اظہار کیا اور کسی غیر مناسب جواب کا انتظار کیے بغیر ایک مفرور مجرم کی طرح چپکے سے باہر نکل آیا۔

کیمپنگ میونسپل جانے والی بس میں زیادہ تر قرطبن عورتیں سوار تھیں جن کی قربت میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اپنے آبائی گاؤں جوکالیاں کی کسی شادی میں شرکت کر رہا ہوں۔ نندرا میراثی چنبیلی کے تیز عطر کا "تونبا" چٹکی میں دبائے چوہدریوں کے کھدر کے کُرتوں کو عطر بیز کر کے لاگ وصول کر رہا ہے۔ بھاگ لگے رہن...... میرے کُرتے پر بھی تُونبے کا وار ہوتا جس کے نتیجے میں اگلے کئی روز تک میں زکام میں مبتلا رہتا۔ قرطبہ کی بس میں مجھے جوکالیاں یوں یاد آیا کہ ان خواتین نے نہایت فراخدلی سے اسی قسم کا جٹکا چنبیلی کا تیز عطر اپنے فراخ جسموں پر چھڑک رکھا تھا۔ چنبیلی کی تیز خوشبو اور آنکھوں کے گرد نیلے میک اپ

کا استعمال ہسپانوی نازنینوں کا پسندیدہ سنگھار ہے۔ مجھے رہ رہ کر اس میکسیکن ہیٹ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ لڑکی کیمپنگ والی عورت کی مانند پُراسرار تو نہ تھی مگر شام ڈھلے وادی الکبیر کے کنارے ایک کھنڈر کی تہہ میں یوں اعتکاف میں بیٹھنا میری سمجھ سے باہر تھا۔

جستجو کا اسفنج جو آج صبح پرندے کے پَر سے بھی ہلکا تھا، تمام دن کھوج کے پانیوں میں ڈوبا رہنے کے باعث اب اُٹھائے نہیں اُٹھتا تھا۔ چنانچہ کیمپنگ پہنچتے ہی میں نے تازہ دم ہونے کے لیے تالاب کا رُخ کیا۔ راستے میں مراکشی حسن کا خیمہ پڑتا تھا جو اپنے پورے خاندان سمیت ایک قالین پر براجمان کافی پینے میں مشغول تھا۔ ظاہر ہے مجھے بھی بٹھا لیا گیا۔ کافی اور سینڈوچوں سے فارغ ہو کر حسن بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ تالاب کے قریب حسبِ معمول پھونس کی جھونپڑی میں بوڑھی خادمہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی مالکہ سنگِ مرمر سے تراشیدہ کسی زندہ مجسمے کی طرح پُرسکون پانی میں تیر رہی تھی۔ حسن کے لیے بڑھیا کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ اُبھری جو مجھے ہمراہ دیکھتے ہی ڈوب گئی۔ میں نے اپنا تولیہ حسن کے حوالے کیا اور تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ پانی کی ہلچل بھورے سنگِ مرمر تک پہنچی تو اس کی سیاہ آنکھیں لہروں کے تلاطم کا پیچھا کرتیں مجھ تک آ گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں وہی نجوم کی وحشی چمک تھی۔ گردن تک تہ آب ہونے کے باوجود میرے جسم کے پوروں سے پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے۔ مجھ میں اس عورت سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ تھی۔ اس اثنا میں کسی نامعلوم اشارے کے تابع بڑھیا جھونپڑی میں سے نکل کر تالاب کے کنارے آ چکی تھی اور اُس نے سفید لبادہ اس انداز سے آگے پھیلا رکھا تھا کہ تالاب سے نکلتے وقت میں اُس کا جسم نہ دیکھ پایا۔ لبادہ اوڑھ کر اس نے بالوں کو جھٹکا اور خادمہ کے ہمراہ اپنے خیمے کی جانب چلی گئی۔

نہانے سے فارغ ہو کر حسن اپنے خیمے میں سے مراکو میں کشید کردہ ریڈ وائن کی ایک بوتل اُٹھا لایا۔ بقول اُس کے یہ چونکہ بے حد ہلکی ہونے کی وجہ سے مخمور نہیں کرتی اس لیے اس پر مذہبی ٹیبو لاگو نہیں ہو سکتا تھا۔

کیمپنگ کے پہلو میں سے جاتی ہوئی سڑک پر وقفوں سے گزرنے والی ٹریفک بھی ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے سیرا مورینا کی بلندیوں پر اُڑتے ہوئے جھینگروں کا شور بمشکل سُنائی دیتا تھا۔ جُوں جُوں رات گہری ہوتی گئی یہ شور قریب آتا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے گرد پھیلے ہوئے زیتوں کے درختوں میں گونجنے لگا۔ ہم گئی رات تک تالاب کے کنارے بیٹھے دنیا جہان کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے مگر میرے ذہن پر وہ سفید لبادے والی عورت ایک آسیب کی طرح مسلط تھی۔ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے حسن سے پوچھا۔
"حسن! تم تو کئی روز سے اس کیمپنگ میں مقیم ہو...... یہ عورت اور اس کی بوڑھی خادمہ...... کیمپنگ میں اُن کی موجودگی سے مجھے تو اپنے خیمے میں بھی سوتے ہوئے خوف آتا ہے۔"
حسن کا شگفتہ چہرہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تمھیں بھی ان کے بارے میں تجسس ہو گا۔ میں شروع شروع میں تمھاری طرح اس کی آنکھوں سے اُس کے وجود سے خوفزدہ ہو گیا تھا" وہ تالاب کے پانی میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگا "لیکن مجھے بھی صرف آج ہی اصلیت کا علم ہُوا ہے۔ آج صبح میرے بیوی بچے مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ میں ناسازیٔ طبع کی بنا پر اپنے خیمے میں اکیلا لیٹا ہُوا تھا کہ یہ بڑھیا اندر آئی اور عربی زبان میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی میری مالکہ ہمیشہ ناشتے میں دُودھ کے ساتھ کھجوریں استعمال کرتی ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے اور آپ چونکہ عرب ہیں اس لیے

شاید...... کھجوریں تو میرے پاس نہ تھیں البتہ میں نے اُسے قرطبہ کی ایک ایسی دکان کا پتہ بتا دیا جہاں سے یہ بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ وہ شکریہ ادا کر کے باہر جانے لگی تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی مالکن کے بارے میں استفسار کیا۔ پہلے تو وہ جھجکتی رہی مگر پھر میرے اصرار پر ایک ہم وطن مُور ہونے کے ناطے سے اُس نے مجھے سب کچھ بتا دیا...... تمھیں شاید معلوم ہو گا کہ چار سو سال پیشتر جب مسلمان اندلس سے مکمل طور پر نکالے گئے تو اُن میں چند امراء ایسے بھی تھے جو اپنی موروثی حویلیوں کی چابیاں اور املاک کے کاغذاتِ ملکیت اس اُمید پر اپنے ساتھ لے گئے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ایک روز وہ ضرور اپنے آبائی وطن لَوٹیں گے اور ان اُجڑی حویلیوں میں پھر سے بسیرا کریں گے۔ صدیاں گزر گئیں مگر ان اُمراء کی آل اولاد ان کاغذات اور چابیوں کو سینے سے لگائے رہی۔ جب ان سے پُوچھا جاتا کہ اگر تمھارا وطن تمھیں واپس مل بھی جائے تو کیسے اپنے گھر اور باغ تلاش کرو گے تو وہ کہتے 'اللہ ہمیں بتائے گا'...... یہ عورت الظاہر امی بربر قبیلے کے ایک معروف سردار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کا نام ولادہ ہے اور خادمہ کے بقول اس کا شجرۂ نسب اندلس کی مشہور شاعرہ ولادہ سے ملتا ہے۔ ہر سال وہ صحرا سے نکل کر قرطبہ اور غرناطہ میں آتی ہے۔ بوڑھی خادمہ کے تھیلے میں اُن حویلیوں کی قدیم چابیاں اور بوسیدہ کاغذات ہیں جو ان بزرگ شہروں میں اُس کے آباؤ اجداد کی ملکیت ہوا کرتی تھیں۔ وہ پورے دو ماہ ان شہروں کے مُور نقش گلی کوچوں میں اپنے قدیم مسکن تلاش کرتی ہے اور پھر ناکام واپس لَوٹ جاتی ہے۔"
"لیکن حسن یہ تو پاگل پن ہے۔ اُن تمام عمارتوں کے کھنڈر بھی شاید اب زیرِ خاک ہوں گے۔ باغ اُجڑ کر صحرا ہو چکے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ......"
"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو ولادہ سے پوچھو!"
کیمپنگ میونسپل کے تالاب کے درمیان پچھلی شب کا چاند ماند پڑ چکا تھا۔ اس کی عظمت اور زردی ختم ہو چکی تھی مگر پھر بھی ہر سُو ایک بے نام سی ہلکی روشنی پچھلے زمانوں کی درخشندگی کا پتہ دے رہی تھی۔

واللہ! مستنصر باللہ

مسجد قرطبہ کے چوکور مینار کے اندر گھٹا ٹوپ تاریکی تھی۔ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ باہر سفید دھوپ کا سیسہ پگھل رہا ہے۔ آنکھیں گیلی ٹھنڈک محسوس کرتی ہیں اور سُرخ مٹی کی زنگ آلود خوشبو قدامت کا پیام دیتی ہے۔ یہاں بادشاہی مسجد کے مینار کی طرح جابجا مستطیل سُوراخوں میں سے ناچتے ذرّوں کی مدھم روشنی کے شہتیر تاریکی میں نہیں اُترتے۔ نیچے آتے لوگوں کی گفتگو کی گونج خاموشی کے تسلسل میں حائل نہیں ہوتی۔

قیامِ قرطبہ کے دوران میں صبح شہر کے قدیم حصّوں کی آوارہ گردی میں گزرتی دوپہر کو سورج کی تپش ذوکو میں روپوش کسی قہوہ خانے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی جہاں اس کتاب کے لیے نوٹس تیار ہوتے اور پچھلے پہر جہاں کہیں بھی ہوتا قرطبہ کے کھلے آسمان پر مینارِ مسجد کو تلاش کر کے اس سمت چل کھڑا ہوتا۔ درونِ مسجد جانے سے پیشتر باب التوبہ کے پہلو میں واقع ایک مختصر دروازے کو اس اُمید پر آہستہ سے دھکیلتا کہ شاید آج قسمت یاوری کرے، دروازہ کھلا ہو اور میں سیڑھیاں طے کر کے مینار کی چوٹی تک جا سکوں اور پھر ہمیشہ اسے اندر سے مقفل پا کر صحن میں کسی کھجور کے درخت تلے اپنے کیمروں کا تھیلا سرہانے رکھ کر سو رہتا۔ بیشتر شامیں حسن کی رفاقت میں کیمپنگ کے سومنگ پول کے کنارے بسر ہوتیں۔

آج جب حسبِ معمول چوری چھپے دروازے کے قریب پہنچا تو دونوں کواڑ منتظر

باہوں کی طرح کھلے تھے.........

پہلی منزل کی بالکونی سے صحن مسجد یوں نظر آتا ہے جیسے کسی بساط پر کھجور اور زیتون کے سرسبز مہرے رکھے ہوں۔ تیسری منزل پر پہنچا تو میرے سر پر قدِ آدم گھڑیال، لوہے کے کنول اوندھے جھول رہے تھے۔ ان کے اُوپر قرطبہ کا چوکیدار سینٹ رافیل تنہا کھڑا تھا۔ اسی جگہ پر خلیفہ الناصر نے سونے کے بنے ہوئے لٹو نصب کروائے تھے جو ہوا کے چلنے سے گردش میں آجاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ہمارے گاؤں کی کچی مسجد کو ازسرِ نو پختہ تعمیر کیا گیا تھا تو ایک مقامی لوہار نے چاندی کے لٹو بنا کر میناروں پر نصب کئے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے خلیفہ الناصر اور پاکستان کا ایک دیہاتی لوہار وقت اور فاصلے کی گہری خلیج کے باوجود اظہارِ عقیدت کے لیے ایک ہی طریقہ اپناتے ہیں۔ ایک طرف تو صحنِ مسجد تھا، اور دوسری جانب میرے قدموں میں پرانے شہر کی دلآویز سُرخ چھتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ چھتوں کے اس سُرخ سمندر میں خوبصورت پاتیو سرسبز جزیروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ فصیلِ قرطبہ کے باہر شہرِ جدید کی ڈربہ نما عمارتیں تھیں اور پھر اُن سے پرے پورے شہر پر ایک آسیب کی طرح سایہ کیے ہوئے۔ سیرا مُورینا...... مُردوں کے رنگ کا پہاڑ...... کالا پہاڑ! بائیں ہاتھ پر القصر تھا جس کی کھڑکیاں سیرا مورینا کی جانب کھلتی ہیں۔ انہی میں سے ایک کھڑکی کے سامنے کھڑی معتمد کی ملکہ رمیکیہ کی حسین آنکھیں اس کالے پہاڑ کی بدصورتی پر بھر آئیں اور اُس نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا "معتمد! موسم بہار میں قصرِ اشبیلیہ کی محرابوں میں سے مجھے سفید برف پوش وادیاں نظر آتی تھیں، اور قرطبہ میں یہ بدصورت اور کالا پہاڑ میری نظروں کے سامنے آتا ہے۔"

معتمد نے پورے سلسلہ سیرا مورینا پر باداموں کے درخت لگوا دیئے اور اگلے موسم بہار یہ کالا پہاڑ بادام کے شگوفوں سے ایسے ڈھک گیا جیسے ابھی ابھی

برفباری ہوتی ہو صنفِ نازک ہمیشہ سے اس پہاڑ کی سیاہی سے خوفزدہ رہی ہے الناصر نے اپنا بے مثال محل مدینۃ الزہرا اس پہاڑ کے دامن میں تعمیر کیا تھا۔ صدر دروازے کے باہر سنگِ مرمر سے تراشیدہ زاہرا کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ زاہرا نے ایک نظر سفید مجسمے کے عقب میں پھیلے ہوئے سیاہ کوہ پر ڈالی اور دُکھ سے کہا۔ "الناصر! تم دیکھ رہے ہو کہ ایک خوبصورت چہرے کو ایک حبشی نے آغوش میں لے رکھا ہے۔"

ایک بڑا میکسیکن ہیٹ اوڑھے چست جین اور آتشی سُرخ بلاؤز میں بمشکل لپٹی۔ بلاؤز کے اُوپر والے دو بٹن ارادتاً نہیں، قوتِ جسمانی سے مجبور کھلے یقیناً کسی منہ زور گھوڑے کے نتھنوں میں پھنسی باگوں کی طرح تنے ہوئے آمادۂ علیحدگی ایک لڑکی گیلری کی دوسری جانب سے آہستہ آہستہ بے دھیانی میں چلتی ہوئی آئی۔ اس نے ہیٹ کا زاویہ درست کیا اور مینار کے قدموں میں نیچے شہر کی فلم بنانے میں محو ہو گئی۔ کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالے ایڑیوں کے بل بے حد احتیاط سے حرکت کرتی ہوئی، لینز کو قرطبہ کی چھتوں پر سے سرکاتی دیوارِ مسجد تک آئی۔ پھر صحنِ مسجد کو سمیٹا اور اس کے بعد لینز کا دہانہ مجھ پر کھل گیا۔ اس کی ایک آنکھ تو کیمرے کے ساتھ ہی چپکی رہی مگر دوسری چھپاک سے کھل گئی۔

"اوہ" اس نے گڑبڑا کر کیمرہ نیچے کر لیا۔

میکسیکن ہیٹ کے سائے میں کالی بھوری آنکھیں حیرت زدہ کھلی ہوئیں۔ لب نیم وا ابھی تک "اوہ" کی حالت میں۔ رنگ بیشتر یورپی لڑکیوں کی طرح کچی لسی ایسا کچا سفید نہیں بلکہ گاڑھے دودھ جیسا اور عقب میں سیرا مورینا کی سیاہ چوٹیاں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک خوبصورت چہرے کو ایک حبشی نے آغوش میں لے رکھا ہے۔

"سوری" لب "اوہ" کی گولائیوں سے عاری ہو کر بھنچ گئے۔

اُس نے ایک کلاسیکی رقاصہ کے انداز میں گردن جھٹک کر چہرہ آگے کیا۔ آنکھیں میچ کر مجھے انتہائی غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر کیمرہ کیس میں اُڑس کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔ میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اُوپر سایہ فگن سینٹ رافیل کے مجسمے کی جانب نہایت عقیدت آمیز نظروں سے دیکھا جس نے فی الحال مجھے رُسوا ہونے سے بچا لیا تھا۔ یقیناً وہی نیم کریک محترمہ تھیں جو اُس شب پن چکی کی تہہ میں مراقبے میں بیٹھی ہوئی تھیں اور میرے ہاتھوں تہِ سنگ ہونے سے بال بال بچی تھیں۔ میں نے شکرانے کے طور پر مہربان پیر رافیل کی ایک تصویر کھینچی اور ایک محفوظ حفاظتی وقفے کے بعد نیچے اُتر آیا۔

میں ایک سیاہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے مسجد کے اس حصے میں بیٹھا تھا۔ جو المنصور کا تعمیر کردہ ہے۔ آخر شب جنگلوں میں اُترنے والی گہری دھند کی طرح سینکڑوں ستونوں کے گرد تاریکی بال کھولے سو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں استنبول کے زیرِ زمین آبی محل میں کسی ساکت کشتی پر حزن زدہ بیٹھا ہوں۔ صرف ستون پانی کی بجائے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ذخیرۂ آب پر چھت سے مسلسل ٹپکنے والے پانی کے جلترنگ کی بجائے کبھی کبھار رال چلنے کی آواز خاموشی کو توڑتی ہے۔ میرے قریب دو ہسپانوی مزدوروں کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ کدالوں کی مدد سے ایک ستون کے گرد کھدائی کر رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وادی الکبیر کی نمی ستونوں کی بنیادوں پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ اس ستون کی بنیاد بھی آہستہ آہستہ بیٹھ رہی تھی۔ اس لیے اسے اکھاڑ کر دوبارہ ایستادہ کیا جائے گا۔ المنصور کا تعمیر کردہ مسجد کا یہ گوشہ صدر دروازے سے دُوری کی بنا پر بے حد پُرسکون رہتا ہے۔ اکثر سیاح

عبدالرحمٰن الداخل کے حصّے اور محراب کی تصاویر اتار کر کلیسا کے پیٹ میں اُتر جاتے ہیں اور یوں کلیسا کے پچھواڑے میں المنصور کے ستون ان کے بے ہنگم قہقہوں اور فلیش کی ننگی لائٹوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہتے ہیں اور اگر کوئی تجسس ظاہر بھی کرے تو گائیڈ اُسے یہ بتا کر ٹرخا دیتا ہے کہ المنصور کا حصہ عیسائی غلاموں کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا جن کی رُوحیں ابھی تک اس کی تاریکیوں میں منڈلاتی ہیں۔

پچھلے سات روز کی مسلسل آوارہ گردی کے بعد اب قرطبہ کے گلی کوچے میرے لیے ایک کھُلا نقشہ تھے۔ باب المنصورؔ میرے لیے موچی دروازہ تھا، پلازا خو سے انتونیو چوک نواب صاحب اور کالے خلریس، کالے کا میڈاس، المنصور، رومبرو، کوربلا کو پھلاں والی گلی، کوچہ جوگیاں، کوچہ نقارچیاں، کوچہ چیڑہ محل اور کوچہ چابک سواراں وغیرہ کہہ لیجئے۔ قرطبہ کی دو گلیاں تو ایسی ہیں جہاں کھڑے ہو کر آپ بجا طور پر "لہور لہور اے!" کا نعرہ بلند کر سکتے ہیں۔ یعنی پوشتے اقبال اور کالیے لاہور۔

آمد کے پہلے روز جب گاڑی کی رفتار قرطبہ کے نواح میں پہنچ کر بتدریج کم ہونے لگی تو ایک جانب کھجوروں کا ایک وسیع جھُنڈ نظر آیا۔ چاہتِ وطن کی باطنی حس کچھ یوں بیدار ہوئی کہ جیسے یہ تو مقبرۂ جہانگیر کے پہلو میں کھجوروں کا جھنڈ نظر آیا ہے۔ گاڑی بتدریج آہستہ ہو کر راوی کے پُل پر سے گزرے گی۔ دریا میں رواں کشتیوں میں سے ہاتھ بلند ہوں گے اور پھر دس ماہ بعد لاہور سٹیشن کا شور مجھے گھر واپسی پر خوش آمدید کہے گا۔ شاید اسی نفسیاتی اطمینان کی بناء پر قرطبہ سے رختِ سفر باندھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ سفر تو مکمل ہو چکا ہے۔ میں گھر واپس آ گیا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ پھر مجھے اشبیلیہ اور غرناطہ کا خیال آیا۔ غرناطہ سے برِ اعظم افریقہ کتنا دُور ہو گا۔۔۔۔۔۔۔ سوڈیڑھ سو میل۔ اور ابھی مجھے یہ شہر دیکھ کر ہسپانیہ کے طویل مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ فرانس واپس جانا تھا پھر سوئٹزرلینڈ،

آسٹریا، یوگوسلاویہ۔۔۔۔۔۔۔ میں اس خیال سے یک دم دہشت زدہ ہو گیا کہ جس ستون کے ساتھ میں ٹیک لگائے بیٹھا ہوں اس کے اور میرے گھر کے درمیان ابھی نصف دنیا کی اجنبیت حائل ہے جسے عبور کرنے کے بعد ہی میرے کھجوروں کے جھنڈ نظر آئیں گے۔ اس وقت میں اُن سے بہت دُور ہوں ایسے بے چین لمحے سیّاح کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ وہ ان موقعوں پر بلندی پر تنے رسّے پر کرتب دکھانے والے کی طرح ہوتا ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں جھکا کر پستیوں کی جانب دیکھتا ہے اور اس کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے، حرکت! چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوسرے روز سیرا مورینا کے دامن میں بکھرے مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات دیکھ کر اسی شب اشبیلیہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

تیز دودھیا روشنی کا ایک گولا چھُوٹا اور سینکڑوں ستون تاریکی میں سے نکل کر ایک لمحے کے لیے ظاہر ہوئے اور فوراً دھندلا گئے۔ فلیش کی روشنی کے پیچھے میکسیکن ہیٹ کیمرے میں آنکھ جمائے بڑی تندہی سے تصویریں اُتار رہا تھا۔

"ہیلو!" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے زور سے کہا۔

"ہیلو۔ ہیلو" پوری عمارت گونجنے لگی۔

کیمرہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آنکھ سے ہٹا اور اُس نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ہے! میکسیکن ہیٹ" میں نے اس کی گھبراہٹ سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے اندھیرے میں ایک اور تیر پھینکا۔ اِس وار سے اُس نے سمت کا تعین کر لیا اور ستونوں کو ٹٹولتی میرے پاس چلی آئی۔

"کون ہے؟" اُس نے آنکھیں میچ کر پوچھا۔